مصنف

ہربرٹ کیسن

ترجمہ

گروپ کیپٹن (ر) ممتاز علی

انسانی فطرت

اوریجنل ریسرچ سنٹر

10۔علی ٹاؤن۔سٹریٹ 3، اڈیالہ روڈ، راولپنڈی

05 نومبر 2012

19-ذوالحج 1433 ہجری

انسانی فطرت

مصنف ۔ ہربرٹ کیسن

مترجم
گروپ کیپٹن (ر) متیاز علی

اوریجنل ریسرچ سنٹر
10-علی ٹاؤن، سٹریٹ-3
اڈیالہ روڈ۔ راولپنڈی۔ پاکستان

5-نومبر 2012ء
19-ذوالحج 1433 ہجری

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور رسول کریم ﷺ پر درود وسلام اور
اللہ تعالیٰ سے ہدایت ورہنمائی کے ساتھ کتاب شروع کرتا ہوں۔

نام کتاب : انسانی فطرت
مصنف : ہربرٹ کیسن ۔مترجم ،گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی
ناشر : ہاشمی پبلی کیشنز، 0331-5698576۔
ڈسٹری بیوٹر : احمد بک کارپوریشن، عالم بزنس سنٹر، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
کمپوزنگ : میٹرکس کمپوزر، راولپنڈی
تعداد : موسمِ اشاعت
مطبع :
قیمت :

کتاب ملنے کے پتے:

☆.....احمد بک کارپوریشن، کمیٹی چوک، اقبال روڈ، راولپنڈی 051-5558320
☆.....مکتبہ غوثیہ، پرانی سبزی مارکیٹ، عسکری پارک، کراچی، 021-4910584
☆.....علم وعرفان پبلی کیشنز، 34 اردو بازار، لاہور۔فون 042-7352332
☆.....شبیر برادرز، اُردو بازار، لاہور فون 042-7246006
☆.....اسلامی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور
☆.....خزینہ علم وادب، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
☆.....مدنی بک سنٹر، اردو بازار، راولپنڈی
☆.....مسلم بک ڈپو، بنک روڈ، مظفر آباد
☆.....النور بک کارنر، محمدی پلازہ، میر پور
☆.....مکتبہ قادریہ، گوجرانوالہ

مصنف کا پیغام

یہ e-book کتاب ابھی ایک علمی کاوش ہے اور مسودہ کی شکل میں ہے۔ ابھی چھپی نہیں ہے۔ یہ مسودہ کاپی رائٹ نہیں ہے۔ اگر کوئی حصہ ریفرنس کے لئے چھاپنا چاہیں تو چھاپ سکتے ہیں۔ پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ اس میں کسی قسم کی غلطی ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر دلائل میں کمی محسوس کریں تو اپنی تجاویز ضرور بھیجیں۔ اگر اس کتاب کو اس قابل سمجھتے ہیں تو اپنے دوست، احباب سے ضرور شیئر کریں۔

یہ کتاب دوست احباب کے لئے بہترین تحفہ ہے۔

یہ کتاب ہر مرد، عورت، چھوٹے بڑے، استاد، افسر، ماتحت، سب کو ضرور پڑھنی چاہئے۔

افتتاحیہ

1 1981ء میں مجھے چند ماہ کے لئے کراچی سے کوئٹہ میں، سمنگلی ائربیس پر، عارضی ڈیوٹی طور پر بھیج دیا گیا۔نتیجتاً فیملی سے دور، ائیرفورس آفیسرز میس میں رہنا پڑا۔اس لئے فارغ وقت میں مصروفیت کے لئے لائبریری سے مدد لی۔وہاں پر مجھے ہربرٹ کیسن کی کتاب Human Nature پڑھنے کے لئے ملی۔اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے ہم وطنوں کے ساتھ شئیر کرنے کے لئے تبھی ترجمہ کر دیا تھا مگر اس کو چھپوانے کا موقع نہ مل سکا۔

2 2005ء سے میں نے غم روزگار چھوڑ کر ریسرچ ورک سے علمی مشغولیت شروع کی اور کتابیں چھپوانی شروع کیں تو دیمک سے کھایا ہوا مسودہ مل گیا۔اس کی نوک پلک درست کی۔اور 2012ء میں چھپنے کے لئے تیار کیا۔مجھے امید ہے کہ یہ کتاب سب کو نہ صرف پسند آئے گی بلکہ سوچنے اور غور وفکر پر مجبور کر دے گی۔اس لئے کہ مسٹر کیسن کے الفاظ کے مطابق ''تہذیب کے اس دور میں اچھے لوگ بنانے سے بہتر عمل اور کیا ہو سکتا ہے اور اگر ہم بہترین نسل بنا سکے تو اس سے بہتر اور مستحسن کام کیا ہو سکتا ہے''

ہم پاکستانیوں کے لئے خصوصاً، اور مسلمانوں کے لئے عموماً، یہی ضروری اور پہلا کام ہے۔کیونکہ پچھلے 65 سال میں ہم بتدریج منفی رویئے اختیار کرتے جا رہے ہیں اور دنیا میں ہر جگہ رسوا ہو گئے ہیں۔کیا ہماری پاکستانی عمومی پہچان جھوٹے۔منافق، انا پرست، بدمعاش، لالچی اور قابل فروخت ہونے کی نہیں بن گئی ہے کہ امریکنوں کو یہ کہنے کی جرات ہوگئی کہ پاکستانی تو پیسوں کے لئے اپنی ماں بھی فرخت کر دیتے ہیں۔اس بدنامی سے نکلنے کا صرف واحد ذریعہ سوچ بچار کے بعد سچ پر مبنی مثبت رویئے اپنانے میں ہے۔

3 اس دنیا کو اور ہمیں پیدا کرنے والے رب العالمین نے جب ہماری رہنمائی کے لئے اپنے رسولوں میں سے آخری بزرگ ہستی کو تمام دنیا کے لئے رحمۃ اللعالمین ﷺ بنا کر بھیجا۔تو آپ ﷺ کا کام ''اخلاق کی تکمیل'' تھا۔دلوں کا تزکیہ ،اور حکمت وLogic کی تعلیم تھا۔کیا ہم اس تعلیم کو بھول نہیں گئے۔؟

کیا ہم نے اس کے الٹ جہالت، بداخلاقی، بدکرداری، اور بے راہ روی کو نہیں چن لیا؟ کیا ہم دور جاہلیت میں داخل نہیں ہو گئے ہیں۔؟ جاہلیت کا کسی تاریخی دور سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ دور ہوتا ہے جس میں ہر انسان اپنی مرضی کرتا ہے اور کسی قانون پر عمل نہیں کرنا چاہتا۔اس کی بنیادی وجہ ہمیشہ تمام ڈر یعنی اللہ کا ڈر، ملکی قوانین کا ڈر، معاشرے میں عزت بے عزتی کا ڈر۔فوری احتساب اور سزا کے ڈر ختم ہو جانا ہوتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ پاکستان میں یہ سب ڈر نہ ہونے کے برابر ہیں۔؟ کیا ہمارے لئے اپنے دلوں میں جھانکنے کا وقت نہیں آیا؟ ایسا نہ ہو کہ ہمارے اعمال ہمیں Point of no Return سے آگے لے جائیں جس کے بعد اللہ کی پکڑ شروع ہو جاتی ہے۔

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالی کی آزمائش اور عذاب کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے تو اپ نے جواب دیا کہ اگر تو کسی تکلیف اور مصیبت سے تو اللہ تعالی کی طرف فوری طور پر مائل ہو جائے اور اس سے مدد مانگے تو یہ تکلیف آزمائش تھی۔اور اگر کوئی مصیبت یا تکلیف پہنچے اور تو اللہ تعالی کی طرف رجوع نہ کرے اور اس سے معافی یا مدد مانگنے پر مائل نہ کرے تو یہ عذاب ہے۔میرے خیال میں پاکستان پر لگا تار جو بھی مشکلات آ رہی ہین یہ عذاب کی ہی صورت ہے کیونکہ ہم بھیثیت قوم، اللہ سے اجتماعی معافی مانگ کر اپنے اعمال کی اصلاح نہیں کر رہے۔اللہ تعالی ہمیں احساس دے کہ ہم اس کی طرف صدق دل سے رجوع کریں تبھی ہم دنیا میں ترقی کر سکیں گے اور آخرت بھی سنوار سکیں گے۔کیونکہ ہمیں اللہ

تعالی کا حکم ہے کہ مجھ سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی مانگو۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سوچ سمجھ عطا فرمائے آمین۔

گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی

فہرست مضامین

باب نمبر	تفصیل	صفحہ نمبر
باب نمبر۱	ہر انسان چاہتا ہے	
باب نمبر۲	ہر انسان احساسات رکھتا ہے	
باب نمبر۳	ہر انسان میں خوف ہوتا ہے	
باب نمبر۴	ہر انسان دوسرے کی نقل اتارتا ہے	
باب نمبر۵	ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے	
باب نمبر۶	ہر انسان اعتقاد رکھتا ہے	
باب نمبر۷	ہر انسان سوچتا ہے	
باب نمبر۸	ہر ایک عادات رکھتا ہے۔	
باب نمبر۹	ہر ایک بدلتا رہتا ہے	
باب نمبر۱۰	ہر ایک کو تعریف اور سرزنش کی ضرورت پڑتی ہے	
باب نمبر۱۱	ہر ایک رہنما کی عزت کرتا ہے	
باب نمبر۱۲	ہر ایک میں جنسیت ہے	
باب نمبر۱۳	ہر ایک شعوری اور غیر شعوری فعل کرتے ہیں	
باب نمبر۱۴	ہر ایک نصب العین رکھتا ہے	

دیباچہ

کیا یہ حقیقت یا سچ نہیں ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ضروری چیز ''انسانی فطرت'' نہیں ہے؟ کیا یہ بھی درست نہیں ہے کہ اس کے علاوہ ہر دوسری چیز صرف مختلف مشاغل کے باعث ہے؟ حکومت، ادب، فلسفہ، سائنس، عقیدے، کیا یہ سب انسان کے لئے ثانوی حیثیت نہیں رکھتے؟ کیا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس زمین پر جو عمل جاری وساری ہے۔ وہ دراصل ''انسانی فطرت'' کی تکمیل کا عمل ہے؟ اور کیا یہ بھی واضح اور درست نہیں ہے کہ ترقی کرنے اور استعداد بڑھانے کے تمام طریقے صرف سائنس اور انڈسٹری پر منحصر نہیں ہونے چائیں، بلکہ ان کا بنیادی انحصار انسانی فطرت کے علم پر مبنی ہونا چاہیے؟

اگر آپ ان تمام سوالوں کے جواب 'ہاں' میں دیتے ہیں تو پھر آپ آنے والے ابواب میں ضرور دلچسپی رکھیں گے کیونکہ ان میں میں نے انسانی فطرت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کے چند اصول اور اوصاف بیان کئے ہیں۔

انسانی فطرت انسان کی تشریح کرنے کے لئے مناسب لفظ نہیں ہے۔ مگر اس سے بہتر بھی ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں۔ اس لئے اس پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ یہ لفظ یقیناً دوسرے الفاظ مثلاً ذہن، روح، شخصیت، خودی، انا، یا قوت ارادی سے بہتر ہے۔ انسانی فطرت کا نتیجہ ہے پورے کا پورا انسان۔ ذہن، دماغ، جسم، روح، جذبات، قوت ارادی وغیرہ سب کا مجموعہ۔ اس کے لئے ڈکشنری میں سے کوئی اچھا، برا اور انگریزی زبان میں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں جو کہ اس عجیب وغریب مرکب کو، جس میں خیالات، جذبات، گوشت پوست اور ہڈیاں، خوف، امید، عادات، شعوری و غیر شعوری فعل سب موجود ہوں ایک لفظی نام دے سکے۔

اب تک ہم نے انسانی فطرت کو اسکے مختلف پہلوؤں میں دیکھا ہے۔ ایک دکاندار آدمی کو خریدار کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسی انداز سے سٹڈی ہے۔ ڈاکٹر اس کو بطور مشین کے سیکھتا ہے۔ پادری اس کو مذہب کے لحاظ سے پرکھتا ہے۔ غرضیکہ ہر ایک اپنی غرض ومقصد کے مطابق اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ کسی نے بھی اس پر اوور آل طائرانہ نظر نہیں ڈالی کہ انسان کیا چیز ہے، بحیثیت مجموعی۔

ہم نے گھوڑے، کتے، لوہے، پھول غرضیکہ ہر چیز کی فطرت کا مطالعہ کیا ہے۔ ہم نے ستاروں کو گنا اور تولا ہے۔ ہم نے زمین وسمندر کی تحقیق کی ہے۔ مگر ہم نے اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کیا، حالانکہ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ ایک ایک کر کے ہم نے فطرت کے بھیدوں کا کھوج نکالا ہے۔ ہم نے پرندوں سے تیز اڑنا سیکھ لیا ہے۔ ہم پانی کے نیچے تیر سکتے ہیں۔ ہم 12 سیکنڈ میں دنیا کے گرد پیغام بھیج سکتے ہیں۔ ہم نے بھاپ، بجلی، ایٹم کو تابع کر لیا ہے۔ لیکن ابھی تک نہ ہی ہم نے اپنے آپ کو سمجھا ہے۔ اور نہ ہی انسانی فطرت کی تبدیلیوں کا علم سیکھا ہے۔ اور ابھی تک یہ بھی نہیں پہچانا کہ فطرت کا سب سے بڑا بھید انسان خود ہے۔

ہم دراصل خود اپنے آپ کے اتنا قریب اور مانوس ہوتے ہیں کہ اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ جیسے کہ بہت کم آدمی اپنی ناک کی شکل کو تفصیلاً جانتے ہیں۔ اس کے باوجود چند لوگ ضرور گزرے ہیں جنہوں نے اپنی فطرت کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ بھی سائنسی تحقیق اور بے لاگ تبصرے کے ساتھ۔ بعض بڑے لوگوں نے اپنی اپنی ذات پر کتاب لکھی ہے۔ مگر اس میں ڈرامہ پن زیادہ ہے اور سائنسی تحقیق کم۔

کوئی بھی عقل مند آدمی اپنے آپ کو انسانی نسل کے فائدے کے لئے تجزیہ کرنے پر رضامند نہیں ہوگا اور نہ ہی میں یہ غلطی کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ اس قسم کے کام کے لئے اب بھی وقت مناسب نہیں۔ اب بھی اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو بالکل سچے دل سے دوسروں کے فائدے کے

لئے تجزیہ کردے تو ایکدم اس کو پاگل سمجھ لیا جائے گا۔ اگر چہ وہ ہم سب کے لئے ایک انتہائی اہم خدمت سرانجام دے گا مگر مجھے یقین ہے کہ ہم سب اس کو سائنسی شہید بنا کر ہی دم لیں گے۔

اس لئے میرا مقصد اس کتاب کے لکھنے کا صرف اتنا ہے کہ شاید یہ مستقبل کے ڈارون کے لئے راستہ متعین کر سکے۔ تا کہ وہ بھی ڈارون کی طرح انسانی فطرت پر تیس سال تک تحقیق کر کے اس مقدمے کو حل کر دیں۔ میں نے اس سے پہلی کتاب میں بزنس (تجارت) کے اصول بیان کئے تھے۔ اور اب اس کتاب میں انسانی فطرت کے اصول بیان کروں گا۔ میرا ارادہ اور خواہش ہے کہ میں آپ کو دکھاؤں کہ نسل، مذہب، رتبہ، تعلیم کے تفاوت کے باوجود تمام انسان ایک حد تک ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ان کا دکھاوا مختلف ہوگا مگر بنیاد ایک ہی ہے۔ تمام تہذیبوں کی ترقی کے باوجود انسانی فطرت کے اصول نہیں بدلے۔ اور یہ صدیاں گزرنے کے باوجود ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ یہ کراچی، دہلی، پیکنگ، ٹوکیو، لندن، نیویارک، بغداد، غرضیکہ ہر جگہ ایک ہی جیسے ہیں۔ تہذیب مصنوعی ہوتی ہے۔ اس میں سونا کم اور چمک زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ہم سب کو بے وقوف بناتی ہے۔ اس سے ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایک نئی نسل نے جنم لیا ہے۔ مگر یہ سب صحیح نہیں ہے۔ جنگ میں ظلم وستم کی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیب کے باوجود تہذیب کا اثر کھال سے نیچے نہیں جاتا۔ کسی بھی وقت خوف کا پاگل پنے کا طوفان تہذیب کے ظاہر کو اڑا کر لے جاتا ہے۔ اور ہم کو خندقوں میں اکھٹا لڑنے کے لئے جمع کر لیتا ہے۔ کارلائل نے ہمیں بتایا تھا کہ کپڑوں اور شوشا سے مرعوب نہ ہو اور نہ ہی بے وقوف بنو۔ اسی طرح بے کن، نیوٹن، ڈارون، بکسلے نے ہمیں سمجھایا تھا کہ دوسروں کی رائے سے بے وقوف نہ بنیں۔ عملی ہونے کی حیثیت سے برٹش یا انگریزوں میں بالخصوص یہ جراءت پائی جاتی ہے کہ وہ حقیقت کو تسلیم کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اور سچ کی تلاش میں رہتے ہیں، دوسری قوموں کی (Myths) محیر العقول کہانیوں کے۔ اب جبکہ علم کا دور ہے تو وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں۔ اپنی تعلیم، حکومت کے طریقے وغیرہ بدلیں، عادات کو پرکھیں تا کہ ہم زندگی کے مقابلے میں پوری تیاری کے ساتھ جائیں۔ اس کے لئے ہمیں انسانی فطرت کو کھنگالنا پڑے گا۔ تا کہ ہمیں نتائج کی بجائے وجوہات کا پتہ چل سکے۔ جہاں تک میرے اس مضمون پر لکھنے کا تعلق ہے تو میں بڑی دیانت سے کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس مضمون پر عبور نہیں رکھتا اور نہ ہی دعویٰ کرتا ہوں۔ میں تو صرف کسی ایسے شخص کے لئے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جو کہ Descartes کی طرح ڈارون کے لئے راستہ بنا رہا ہو۔ میرا بہانہ یہ ہے کہ میں نے انسانی فطرت کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ میں خوش قسمتی سے ریڈانڈین کے ساتھ بھی رہا ہوں اور لندن میں بھی۔ غریب امیر سب کے ساتھ، جاہل اور پڑھے لکھوں کے ساتھ بھی۔ تجارت کے سلسلے میں مجھے مختلف لوگوں اور مختلف حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس لئے میرا یہ مطالعہ اگر چہ سائنسی تحقیق تو نہیں کہلا سکتا جیسے کہ ڈارون کی Origin of Species، مگر میں نے اس مطالعہ میں عمر صرف کی ہے۔ اور کسی تھیوری، فلسفہ پر اس کا انحصار نہیں۔

امید کی جا سکتی ہے کہ کسی دن ایسے آلے ایجاد ہو جائیں گے جس سے انسانی جذبات، خیالات، دل کے احساسات کو ماپا جا سکے تا کہ انسانی شخصیت کا راز فاش ہو سکے۔ اگر چہ اب بھی ہم اس خیال کو پسندیدہ یا ممکن الحصول نہیں سمجھتے ہیں کہ فطرت کے بارے میں جانیں۔ ہم جانے پہچانے خیالات، دھندلے ذہنوں کے ساتھ زندہ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے۔ کہ مستقبل میں کوئی شخص ماضی کے فرسودہ خیالات سے کٹ کر اس بھید کو کھولے گا۔ فی الحال بنیادی حقیقتوں کو بیان کرنا ہی کافی سمجھتا ہوں۔

ہربرٹ کیسن

پہلا باب

ہر انسان چاہتا ہے

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ چیزوں کو چاہتا ہے۔ ہر شخص چاہنے کا مجموعہ ہے۔ کسی کے پاس سب کچھ موجود نہیں۔ ہر ایک ہر وقت چاہتا ہی رہتا ہے۔ ہر ایک دن میں کئی دفعہ بھوکا ہوتا ہے اور کھانا چاہتا ہے۔ کھانے کی چاہت ہر ایک کو ہے۔ شاعر شیلے بھی صرف خیالات کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بھی تین دفعہ کا کھانا اسی باقاعدگی سے چاہتا تھا۔ جیسے کہ ایک کسان دنیا میں۔ کوئی پادری ایسا نہیں ہے جو کہ صرف روحانی اشیاء پر زندہ رہ سکے۔ وہ بھی انڈے آلو، روٹی، وغیرہ چاہتا ہے۔ ان شاعروں اور خیالی فلاسفروں کے خیالات سے لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کھانے پینے کی اشیاء بیچنے والے کو حقیر جاننے لگتے ہیں۔ حالانکہ انسانی ضروریات میں وہی سب سے پہلے آتے ہیں۔ پہلے ہوا پھر کھانا ہی نوزائیدہ بچے کی دو ضروریات ہوتی ہیں۔ ہر بچہ پیدا ہوتے ہی کھانے کے لئے چلانا شروع کر دیتا ہے۔ یعنی وہ چاہتا ہے۔ چاہنا ہی دراصل زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ کھانا ہی دنیا کی اہم ترین ضرورت ہے جب تک یہ مل نہ جائے۔ اسی لئے اچھا کھانے پینے والے غریبوں کی اس ضرورت کو حقارت سے دیکھتے ہیں اس میں ان کی لالچ اور بددیانتی دنوں شامل ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں کہ رائل سوسائٹی برائے سائنس کو اگر تین وقت کھانا نہ ملے تو وہ سائنس اور فلاسفی کی طرف کتنا وقت اور توجہ دے گی۔

کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے کہ ''یہ دنیا پیٹ کے بل پر چلتی ہے''۔ جنگ عظیم نے انگریزوں کو چینی، روٹی اور آلو کی صحیح قدر و قیمت پہچاننے کا موقع دیا۔ ہر ایک چاہتا ہے اور سب سے پہلی ضرورت ''کھانا''۔ کھانے کے بعد کپڑے آتے ہیں۔ ایک بھوکا آدمی اپنی پتلون اتار کر کے بھی کھانا حاصل کرے گا۔ مگر جونہی اس کا پیٹ بھر جائے گا۔ وہ پھر دوسری پتلون کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ تمام انسان کپڑے چاہتے ہیں تین وجوہات کی بنا پر۔ اول جسم گرم رکھنے کے لئے دوم حیا و شرافت کے لئے، سوم فیشن یا اچھا لگنے کے لئے۔

یہ دو ضرورتیں یا چاہتیں، کھانا اور کپڑا۔ دنیا کی تجارت کے (2/3) دو تہائی پر حاوی ہے۔ ہم چاہے کتنے ہی عقل مند ہو جائیں ہم اپنے جسم کو کھانا اور کپڑے دیکر بھوک اور سردی سے بچانا چاہیں گے۔

روٹی کپڑا مکان! یہ تین بنیادی ضرورتیں ہیں۔ کھانا لباس اور گھر۔ یہ تینوں ہر انسان کی ضرورت ہیں اور ہر ایک ان تینوں کو چاہتا ہے۔ چاہے وہ بادشاہ ہو۔ شاعر، کسان، جنرل، سپاہی فلاسفر یا کوئی اور۔ ذرا سوچئے! کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کھانے، کپڑے اور مکان کے بغیر کب تک ذہنی کام کئے جائیں گے۔ حالانکہ یہ تینوں چیزیں تمام اسکالر بالکل ہی بھول جاتے ہیں۔

یہ تین چاہتیں زندگی کی اہم ترین چاہتیں ہیں۔ مگر ان کے بعد انسان کیا چاہتا ہے اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔ ہماری تمام زندگی خواہش کرنے میں نکل جاتی ہے۔ بلکہ زندگی نام ہی خواہش کا ہے جن میں چند مکمل ہو جاتی ہیں چند ادھوری رہ جاتی ہیں۔ مثلاً کانگو میں ایک حبشی سیپیوں کا ہار چاہتا ہے۔ جبکہ یورپ میں ایک حسینہ ہیروں کا ہار چاہے گی۔ ایک دوشیزہ خاوند چاہے گی غرضیکہ ہر ایک کوئی نہ کوئی چیز چاہتا ہے۔

تمام تجارت کی بنیاد ہی اس خواہش پر ہے۔ تمام اشتہارات نئی خواہشوں کو جنم دیتے ہیں۔ تاکہ ان کا مال بکے۔ تمام ہوائی جہاز ریل گاڑیاں ذریعہ حمل و رسل بنتی ہیں ان لوگوں کے لئے جو دوسری جگہ جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح تمام فیکٹریاں دن رات کام کرتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کی

خواہشوں کی تکمیل ہو سکے۔

''انسانی فطرت ایک شعوری حالت ہے جو کہ خواہشوں سے بھرپور ہے''۔ یہ چاہتی ہے۔ اسے ہر نئی چیز کی بھوک ہوتی ہے۔ یہ خواہش سے بے دم ہو جاتی ہے۔ جب اس کے پاس کوئی چیز نہ ہو تو اس کی ہمیشہ سے یہی پکار رہی ہے کہ کاش میرے پاس اور کچھ اور ہوتا۔

بدھ مت کی تعلیم ہے کہ نروان یا خواہش سے پاک حالت کو حاصل کرو۔ بدھ بھکشو کہتے ہیں کہ جب تک انسانی روح خواہش کرنا بند نہیں کرتی۔ تب تک امن، سکون نہیں مل سکتا۔ یہ شاید درست ہو؟ مگر بدھ بھکشو بھی خواہش کے بغیر نہیں رہ سکتے جب تک وہ اس دنیا پر زندہ ہیں۔ صرف ایک مردہ ہی بغیر خواہش کے ہو سکتا ہے۔ زندہ لوگ خواہش کرتے رہیں گے۔

زندگی کی دوڑ میں خواہش ہی مہمیز کا کام دیتی ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جسکی وجہ سے پرندے، مچھلیاں اور جانور تک ہجرت کرتے ہیں۔ اس طرح لوگ قبیلے اور قومیں بھی ہجرت کرتی ہیں۔ یہی خواہش رومن ایمپائر، امریکہ کی دریافت اور جنگ عظیم کا باعث بنی۔

وہ آدمی جو اس حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں لیڈر بن جاتے ہیں۔ کمرشل لیڈر وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی خواہش کو پورا کرے۔ یہی ملٹری لیڈر، ادبی اور ثقافتی لیڈر شپ میں بھی سچ ہے۔ سیاسی لیڈر بھی یا تو لوگوں کو ان کی خواہش کے مطابق دیتے ہیں۔ یا دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔

اگر میرے پاس بڑی دکان ہوتی تو میں اس پر یہ فقرہ لکھتا ''یہاں پر آپ کو اپنی پسند اور خواہش کی ہر چیز ملتی ہے جس کی آپ کو تلاش تھی۔ Here is where you can get what you want. یہ ہر دکان کے لئے بہترین فقرہ ہے۔

ہر کامیاب دکاندار جانتا ہے کہ ایک خریدار وہ آدمی ہوتا ہے جو کہ اس کی چیز کو چاہتا ہے بجائے قیمت چاہنے کے۔ اسی لئے سیلز مین کا آرٹ یہ ہے کہ وہ یہ خواہش بیدار کرتا ہے۔ آپ یا تو لوگوں میں اس چیز کی خواہش پیدا کریں جو آپ کے پاس موجود ہے۔ یا ان کے لئے وہ چیز رکھیں جو وہ چاہتے ہیں۔ صرف یہی دو طریقے ہیں جن سے آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اور تیسرا کوئی طریقہ نہیں۔ کامیابی صرف وہی نہیں ہوتی جو آپ خود اپنے طریقوں سے کرتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت کامیابی وہ ہوتی ہے جو دوسرے لوگ آپ کے لئے کرتے ہیں۔

استعداد اور کامیابی میں بڑا فرق ہے۔ اور میں اس کتاب میں کامیابی کے متعلق بات کر رہا ہوں۔ زیادہ تر شاعر، آرٹسٹ، موجد (Pioneers) اس فرق کو نہیں سمجھتے۔ وہ لوگوں کی خواہش کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اپنے آپ کو خوش کرنا چاہتے ہیں.۔ وہ صرف اپنے خیالات کو ہی سنتے ہیں۔ وہ اپنے لئے اپنے (Ideas) بناتے ہیں۔ پھر قدرتی امر ہوگا کہ جب وہ لوگوں کو نظر انداز کریں گے تو لوگ یا پبلک ان کو نظر انداز کرے گی۔ لوگ ان کی نظمیں تصویری کہانیاں مشینیں خریدنے سے انکار کر دیں گے۔ اور نتیجتاً ایسے لوگ غریب رہیں گے۔

یہ اتنی ناانصافی نہیں جتنی کہ ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کیک کھائیں بھی اور وہ بچا بھی لیں۔ اگر آپ لوگوں کو خوش کرنا چاہیں گے تو وہ آپ کو مالدار بنا دیں گے۔ اگر آپ اپنے آپ کو خوش کرنا چاہیں گے تو آپ کو ذاتی خواہش یا انا پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ اور آپ کو اس پر شاکر رہنا چاہیے۔ اور امید کرنی چاہیے کہ آپ کے مرنے کے بعد لوگ اس چیز کا احساس کریں گے۔ اور آپ کو یاد کریں گے۔

اگر آپ تجارتی دنیا میں آنا چاہتے ہیں تو لوگوں کی خواہشوں کو دیکھیں۔ ان کا مطالعہ کریں۔ ان کا خیال رکھیں۔ ان کو خوش رکھیں۔ آپ صرف اپنے آپ کو خوش کرنے کی جراءت نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ آپ اوسط درجے کا ذہن رکھتے ہوں اور اوسط درجے کے خیالات۔ آپ کسی قسم کی ذاتی خواہش، اور سوچ و بچار یا خیالی پلاؤ میں بھی منہمک ہونے کی جراءت نہیں کر سکتے۔ آپ کے قرضے آپ کی مجبوریاں آپ کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیں گی۔

بہت ساری فرمیں صرف اس لئے تباہ ہوگئیں۔ کیونکہ ان کے ڈائرکٹروں نے پبلک کوخوش کرنے کی کوشش نہ کی۔تو پبلک نے ان کوسخت سزادے کردیوالیہ بنادیا۔ یہ صرف اس لئے تھا کہ انہوں نے ''ایک دوسرے کی خدمت'' کے کائناتی اصول کی خلاف ورزی کی۔حالانکہ اس اصول پرتمام لین دین قائم ہے۔

اب آپ کواندازہ ہوگیا ہے کہ یہ اصول کہ ''ہرانسان چاہتا ہے'' انتہائی اہم اصول ہے اس اصول پراخلاق اورتجارت کا دارومدار ہے ۔اسی پرشخصیت، کریکٹر، اورکامیابی کا انحصار ہے۔مجرم، ملزم اور پاگل وہ ہوتے ہیں۔جن کی خواہش حقیقت سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔

کوئی بھی تدریسی سلسلہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک وہ بچوں میں ان خواہشوں کوکنٹرول کرنا نہ سکھادے۔کن خواہشوں کو پورا کرنا چاہیے۔کون سی خواہشیں غلط ہیں۔جوخواہش سماجی طور پرناپسندیدہ ہیں ان کو کیسے قابو میں کیا جائے۔یہ سب سکھانا ہی استاد کا کام ہے۔اگر وہ یہ نہیں سکھاتا تو پھراس استاد کا کیا فائدہ۔

اگرہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنی خواہشوں کوقابو میں کرکے ترقی کرے۔اخلاقی طور پر۔اور ہماری نئی نسل ہم سے بہتر ہو اخلاقی طور پرتو ان کی خواہشوں کوقابو میں کرنا۔ان کواس کا شعور دلانا۔اورطریقے سکھلانا یہی وہ طریقہ ہے جس سے وہ ہم سے بہتر ہوسکتے ہیں۔ان کوشروع سے ہی یہ سکھلانا ضروری ہے کہ ہروہ چیز جس کی وہ خواہش کریں اور چلائیں۔ضروری نہیں کہ پوری کی جائے یا ہوجائے۔اس طرح لڑکے اورلڑکیاں دوسروں کی خواہشات کا مطالعہ کریں اورسیکھیں کہ دوسروں کا بھلا کرنے میں ہی اصل خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ہرانسان چاہتا ہے'' یہ انسانی فطرت کا پہلا اصول ہے''۔اور یہی اصول تمام انسان اپنے برتاؤ میں بھول جاتے ہیں۔اورنقصان اٹھاتے ہیں۔

دوسرا باب

ہر انسان احساسات رکھتا ہے

ہربرٹ سپنسر بھی جو کہ جذبات احساسات نہ رکھنے کے لئے مشہور تھا اپنی آخری عمر میں کہنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ دماغ میں آدھے سے زیادہ جذبات شامل ہیں۔

ہمارے دماغ توجیہ، حساب دانی یا Logic سے معمور نہیں ہوتے بلکہ جذبات نے اسے گھیرا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ہم حقائق کو نہیں ڈھونڈتے بلکہ ایک عام آدمی جس چیز کو سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہے۔ وہ سچ اور حقائق کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر کہا گیا ہے کہ جب کوئی موجد ایک حقیقت کو پالیتا ہے۔ اور خوشی سے لوگوں کو بتانا چاہتا ہے۔ تو لوگ اس سچ کا مقابلہ کرنے کی بجائے اس کو روند ڈالتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کے اس سچ یا حقیقت کو بھی۔ یاد رکھیں سائنس اور Reason بالکل نئی چیزیں ہیں بلکہ تہذیب بھی فی زمانہ ایک تجربہ ہی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کسی پرانے درخت پر نیا پھول نکل آیا ہو۔

ہم پرانی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں۔ میرے مطابق کوئی چیز پرانی نہیں۔ انسانی نسل ہزاروں سال سے بغیر تاریخ لکھے زندہ ہے۔ بلکہ 9/10 حصہ اس کا بغیر تحریر شدہ تاریخ کے حصے سے ہے۔ اس لئے ہم اتنے لمبے عرصے کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ انسانی نسل کے اس زمین پر آنے کے وقت کو ہم 12 گھنٹوں میں تبدیل کر سکیں۔ تو کیا یہ سچ نہ ہوگا کہ پہلے ساڑھے گیارہ گھنٹے بغیر تحریر شدہ تاریخ کے ہونگے۔ بابل کی تہذیب صرف 20 منٹ پہلے ختم ہوئی۔ بیکن نے سائنسی طریقہ صرف دو منٹ پہلے ایجاد کیا۔ اور واٹ نے بھاپ کا انجن صرف دو منٹ پہلے۔ اور اگر ہم انسانی نسل کے یہ 108,000 سال گنیں تو ہماری انڈسٹری کو شروع ہوئی صرف تیس سیکنڈ ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس وقت کا تصور کر سکتے ہیں تو پھر جذبات کی اہمیت کو پہچان لیں گے۔

علم، تعلیم، تہذیب، عقل کی پتلی تہہ کے نیچے جذبات کی پختہ بنیاد موجود ہے۔ جب تک ہمیں ٹیسٹ نہیں کیا جاتا۔ امتحان میں نہیں ڈالا جاتا تو ہم سب باعزت بااصول نظر آتے ہیں۔ مگر کوئی بھی اچانک واقعہ یہ تہہ اتار کر جذبات کو ابھار لیتا ہے۔ اور جذبات ہی پھر اعمال کو کنٹرول کرتے ہیں۔ سچ جانئے کہ محبت فطرت میں شامل نہیں یہ بھی دوسری عادات کی طرح حاصل کی جاتی ہے۔ اور اس میں بہت ہی کم پڑتے ہیں۔ تمام ملکوں میں ہزاروں سال رہنے، ضرورت کے تحت قانون بنانے اور ظاہری تہذیب کو اپنانے کے باوجود صرف ظاہر میں ہی قانون کی حکمرانی ہے۔ اور اس سے ہمیں دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ صرف چند آدمی اور چند شہر ہی اتنے تہذیب یافتہ ہونگے جتنے نظر آتے ہیں۔ اگر آپ کو شک ہو تو آپ شہر کے شریف ترین علاقے میں رات کو چلے جائیں اور پھر تماشا دیکھیں جیسے کہ میں نے ایڈنبرگ کی ہفتے کی شام کو جا کر دیکھا۔

بہترین اور بدترین جذبات عام طور پر عوام میں پائے جاتے ہیں۔ ایک پھول تب ہی زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ جب وہ ریگستان میں یا خارستان میں کھلا ہو۔ میں نے عام طور پر غریبوں میں ہی ہمدردی کے جذبات دیکھے ہیں۔ امیر عام طور پر اس سے عاری ہوتے ہیں۔ بلکہ کھلے دل ہونے کے لئے بھی غریب ہی مشہور ہیں۔ ایک غریب آدمی اپنے دن کی آمدنی اپنے غریب بھائی کو دے دے گا۔ مگر امیر کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ تو آپ نے دیکھ لیا کہ سائنس تو صرف دو صدی پرانی ہے۔ جبکہ جذبات انسانی نسل کے ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے۔ اور اتنے ہی پرانے ہیں جتنی کہ یہ نسل۔

جذبات۔حسد۔رشک!نفرت۔افسوس۔خوشی۔شرم۔غصہ۔رحم۔ناامیدی۔محبت سب سے برتر محبت کے جذبات۔انہی جذبات سے ہی تو انسانی نسل بنائی گئی ہے۔شروع سے ہی ان ہی کا کنٹرول تھا۔اوراب بھی یہی اپنا اثر دکھاتے ہیں۔جیسے کہ زمین کی تہہ میں ابلتا ہوالاوا موجود ہے۔ اوراس کے اوپر ایک چھوٹی سی تہہ موجود ہے۔ایسے ہی انسانی فطرت ہے۔جذبات کا ابلتا ہوالاوااوراس کے اوپر قانون اوررسوم وتہذیب کی ہلکی سی تہہ۔

اگرآپ ایک عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو کہ بلند وبالا ہوتو اس کی بنیاد بھی اتنی ہی گہری ہونی چاہیے۔یعنی انسانی دل کے اندرونی جذبات پراس کی بنیاد ہونی چاہیے۔آپ جذبات کو نہ ہی نظرانداز کرسکتے ہیں نہ ہی بھول سکتے ہیں اورنہ ہی ان سے لڑ سکتے ہیں۔یہ حقیقت سمجھ لیں اس لئے کہ جب تک یہ زمین قائم ہے۔یہ سچ ابدی رہے گا۔قانون سخت ہے۔رسوم سخت تر ہیں۔مگر یہ دونوں نتائج ہیں وجوہ نہیں۔کیونکہ یہ جذبات کے ہی پیدا کردہ ہیں۔اور جب تک ان کے پیچھے جذبات نہ ہوں۔ان پر عمل درآمد کرانا مشکل ہوتا ہے۔

کسی بھی قوم کے نغمے۔لطیفے۔میوزک۔پھول۔طوفان۔غرضیکہ یہ بنیادی چیزیں ہیں جو کہ حکومتوں، مارکیٹ، مذاہب کو بناتی اور بگاڑتی ہیں۔اس لئے ہم دنیا کی اس عظیم طاقت جس کو جذبات کہتے ہیں نظرانداز نہیں کرسکتے۔اوراس کی بجائے فرض کرلیتے ہیں کہ اصل قوت پیسہ،علم یا سیکرٹری وغیرہ ہیں۔اس طرح ہم Efficiency کے لئے مشینری،خودکاری، Regimentation یا کارڈ سسٹم پر انحصار نہیں کرسکتے۔اس لئے جس سسٹم کی بنیاد انسانی جذبات پر نہ ہوگی وہ سسٹم کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتا۔

ترقی کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ مالک اورنوکر کے درمیان دوستی محبت کے جذبات ہوں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری فیکٹریوں، دکانوں، کارخانوں میں انسانی فطرت کو جاننا ضروری ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سٹاف کی ٹریننگ ہونی چاہیے۔اجتماعی میٹنگ ہونی چاہیے۔ ورکروں کی کمیٹی ہونی چاہیے۔اورانصاف ہونا چاہیے۔میں نے بہت دفعہ دیکھا ہے کہ کسی اجتماعی میٹنگ میں جس میں ڈائریکٹراورنوکر ساتھ مل کر گپ شپ لگائیں تو اس کے بعد کام زیادہ ہوتا ہے۔اورخرچ کم۔ایک اچھے کارخانے میں کوئلے کی قوت، بازو کی قوت کے ساتھ ساتھ دل کی قوت ہوتی ہے۔فیکٹری میں چیزیں نہیں بلکہ لوگ کام کررہے ہوتے ہیں۔فیکٹری میں سکون اوراچھے تعلقات کی قدر کی جاتی ہے۔

جنگوں میں یہ تجربہ ہے کہ فوج کے جذبے سے زیادہ اورکوئی چیز فائدہ مند نہیں ہوتی۔یعنی جذبہ جو کہ جذبات ہی جذبات ہیں اس طرح کوئی بھی فرم یا کمپنی اپنے مزدوروں میں فتح کا جذبہ ڈال کر کامیاب ہوسکتی ہے۔اس طرح پرچون کی دکان پر بھی یہی حال ہے۔بعض دکانداروں میں بے توجہی کا سماں ہوتا ہے۔اوروہ بانجھ سی لگتی ہیں۔جن میں جوش وجذبہ کا فقدان ہوتا ہے۔جبکہ دوسری دکان میں توجہ،شوق،اخلاق سب کچھ ہوگا۔آپ کسی بھی عورت سے پوچھ لیں وہ آپ کو تمام دکانوں کا حلیہ واخلاق بتادیں گی۔

شیلڈن نے ثبوت مہیا کیا ہے کہ سیلز مین کی کامیابی کا راز صرف اس کی اس مہارت میں ہے جس سے وہ خریدار کی پسند اور جذبہ کا اندازہ لگا سکے۔صرف چیزوں کے سجانے، بہترین بات یا سودا کرنے کا طریقہ نہیں ہے۔بلکہ خریدار کے نقطے کی سمجھ ہے۔شیلڈن کہتا ہے کہ بیچنے میں سب سے پہلی بات دوسرے کی توجہ کا حاصل کرنا ہے۔اور یہ دوسرے سے زیادہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔بہ نسبت توجہ یا انرجی کے۔مثلاً کوئی بھی بیچنے والا خریدار کو اچھے موڈ میں لائے بغیر چیز نہیں بیچ سکتا۔

یہی حال تعلیم کا ہے۔جولڑکا اپنے استادوں کا اورسکول کا مداح نہ ہوگا۔وہ کیا خاک تعلیم حاصل کرے گا۔جولڑکا اپنے اسباق سے نفرت کرتا ہو۔اپنے استادوں سے ڈرتا ہو یا نفرت کرتا ہو۔اوراپنے سکول میں بور ہوتا ہو۔وہ تعلیم کا شوق کیا رکھے گا۔پتہ نہیں کب ہم اپنے ذریعہ تعلیم کو

رسوم پسند استادوں سے چھڑا کر ایک ایسا سسٹم بنا سکیں گے جس میں ہم اپنے بچوں کے جذبات سے تعلیم دے سکیں گے۔ اور ان کے جذبات کو دبائیں گے نہیں۔ کب ہم زندگی کا سبق سکھائیں گے۔ بجائے موت کے۔ انسانی جذبات کا علم بہت ہی گہری سوچ بچار چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ جس میں انسانی جذبات کا عمل دخل نہ ہو۔ اور جو جذبات کو سمجھے بغیر حل کئے جا سکیں۔

یاد رکھیں چاہے گھر ہو یا سکول یا فیکٹری۔ سب میں جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ میں اس حقیقت کو نہ ہی جھٹلا رہا ہوں۔ نہ ہی برا کہہ رہا ہوں۔ یا اچھا کہہ رہا ہوں۔ بلکہ صرف اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ ہم سب اس حقیقت کو عام طور پر فراموش کر دیتے ہیں۔ جذبات ہر چیز سے پہلے بنائے گئے ہیں۔ اور اس وجہ سے کوئی بھی آدمی اس وقت تک یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ایک جگہ کیوں رہ رہا ہے۔ یہ کن لوگوں کے ساتھ کس وجہ سے تعلق رکھ رہا ہے۔ جب تک وہ جذبات کی حقیقت کو نہ سمجھ لے۔ اور جذبات کی قوت کا اندازہ نہ کر لے۔

تیسرا باب

ہر انسان میں خوف ہوتا ہے

ڈر! خوف! یہ احساس ایسا ہے کہ جو کہ بنیادی طور پر ہر ایک انسان میں پایا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے اس پر پورا باب لکھا جا رہا ہے۔ خوف شاید تمام محرکات میں سے سب سے طاقت ور محرک ہے۔ یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ زندگی۔ یہ ہر جگہ اور ہمیشہ انسانی اعمال کا بڑا محرک رہا ہے۔ فطرت کا پہلا قانون قانون تحفظ ہے۔ ہم سب زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم زندہ رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور مختصراً ہر اس چیز سے ڈرتے ہیں جو ہماری زندگی کو خطرہ بن سکتے ہیں۔

فطرتاً ہم ہر اس چیز سے جس کی ہم کو سمجھ نہ آئے خوف کھانے لگتے ہیں۔ بکری کا بچہ گائے سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ چھوٹا پرندہ ایک بچے سے بھی ڈرتا ہے۔ دھیان رکھو۔ ہر ایک پر شبہ وشک کرو۔ لڑنے یا بھاگ جانے کے لئے تیار رہو۔ یہ سب کچھ غالباً پہلا خیال ہوتا ہے جو بچے کے ذہن میں جگہ پاتا ہے۔ یعنی خوف کا خیال۔ آپ اس کا جواب شاید یہ دیں گے کہ یہ شاید وحشیوں کے لئے درست ہو۔ مگر تہذیب یافتہ لوگوں کے لئے نہیں مثلاً کوئی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ لندن کا ایک باشندہ خوف کے تحت سب کچھ کرتا ہے۔

اس کے جواب میں میں پھر یہی کہوں گا کہ خوف لندن میں اور کانگو میں یکساں طور پر کام کرتا ہے صرف خوف کی اقسام کا فرق ہوتا ہے۔ ایک جنگلی حبشی شیر۔ چیتے۔ سانپ سے ڈرتا ہے جبکہ لندن میں رہنے والا سکینڈل، بیماری، چور، اور دیوالیہ پن سے ڈرتا ہے۔ اس طرح گورنمنٹ میں ووٹ ڈالتے وقت یہ ڈر ہی ہوتا ہے۔ جو کہ اپنی پارٹی کو ہی ووٹ دلاتا ہے۔ چاہے ووٹر کی رائے مختلف ہو۔ لوگوں کی رائے کا خوف! کیا یہ خوف حکومت اور گھر ہر جگہ رائج نہیں ہے۔ یہ نسبتاً شریف خوف ہے بہ نسبت سانپوں کے ڈر سے۔ مگر ہے تو خوف کی ہی ایک قسم۔ اور ہمیں غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نہیں ڈرتے۔ کوئی آدمی بھی بالکل ہی ڈرپوک نہیں ہوتا۔ اگر وہ ہوتا تو یہ زندگی برداشت کے قابل نہ رہتی۔ اسی طرح نہ ہی کوئی شخص ڈر اور خوف سے مکمل آزاد ہوتا ہے۔

ہر شخص کے ذہن میں ذاتی قسم کے خوف ہوتے ہیں۔ ایک سپاہی جو کہ جنگ میں بہادری کا سب سے بڑا تمغہ جیت سکتا ہے۔ مگر صرف سکینڈلل کے ڈر سے خودکشی کر لیتا ہے۔ ایک مقرر جو ایک بڑے پر جوش ہجوم کا سامنا کر سکتا ہے گھر میں اپنی بیوی کے غصے سے ڈرتا ہے۔ ائیر فورس کا ایک نڈر پائلٹ جس نے کئی ہوائی جہاز گرائے ہیں دیوالیہ پن کے ظاہر ہونے سے آسٹریلیا بھاگ گیا غرضیکہ ان گنت مثالیں ہیں کہ ہر ایک شخص اپنے ذہن میں مختلف قسم کے خوف رکھتا ہے۔

میری طرح سے بہت سے لوگوں نے تجربہ کیا ہوگا کہ وہ خطرات میں ایک انجانے دل خوش کن جذبے کے ساتھ کود پڑتے ہیں۔ مگر دانت کے درد یا سر درد سے گھبرا جاتے ہیں۔ اور یہ خیال آتا ہے کہ اگر زمین یا جنت میں رہنے کی قیمت یہ درد ہے تو یہ مجھے قبول نہیں حالانکہ بہت سارے لوگ ہیں جو درد کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت بڑی خوشی سے زچہ خانے میں درد برداشت کرتی ہے تاکہ وہ اپنے بچے کو خوشی خوشی حاصل کر سکے۔

ہر کھیل میں خطرے کا پہلو ہوتا ہے تاکہ خطرہ خوشی میں تبدیل ہو سکے۔ اور یہی طریقہ ہمیں خوف دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر زندگی کو بھی کھیل سمجھ لیا جائے۔ جس میں خطرہ ہے مگر ساتھ ہی ساتھ خوشی بھی ہے تو پھر ہم خوف کو بڑی حد تک دور کر سکتے ہیں۔

جہاں بھی ظلم ہوگا اس کے پیچھے ڈر ہوگا۔ ایک ظالم شخص جتنا بھی ڈرائے دھمکائے وہ کسی بھی شخص کو اپنی جراءت کے بارے میں یقین نہیں دلا سکتا۔ اگر وہ ظالم ہے تو وہ دراصل اندر سے ڈر سے مغلوب ہے۔ یہ انسانی فطرت کا اصول ہے اور ایسا واضح اصول ہے جیسے کہ آگ ہمیشہ جلاتی ہے یا پانی ہمیشہ بہتا ہے۔ انگلینڈ میں رحم دلی کی سوسائٹیاں قائم ہوئیں یعنی جانوروں کے ساتھ رحم۔ قیدیوں کے ساتھ رحم۔ پاگلوں کے ساتھ رحم۔ بچوں کے ساتھ رحم۔ ان سے ڈر کم ہونا شروع ہوا۔ اور اس کی جگہ رحمدلی اور انصاف پسندی نے لینی شروع کی۔

انسانی نسل کی سب سے بڑی امید یہی ہوسکتی ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسی تہذیب جنم لے سکے جس میں نہ ڈر ہو نہ خوف نہ استحصال ہو، نہ ہی جنگ و جدل ہو، غربت اور کشت وخون نہ ہو۔ یہ ایسا خواب یا امید ہے جو ممکن نظر نہیں آتی مگر مقصد حیات تو بنایا جا سکتا ہے۔ جب تک یہ امید بر نہیں آتی تب تک ہم کم از کم اپنے خوفوں پر قابو پانے کی کوشش کریں تا کہ زندگی میں آرام سے رہ سکیں۔

آپ اپنے بارے میں خود سے سوال کریں کہ کیا میرے گھر میں خوف کی حکومت ہے؟ کیا میں اپنے افسروں سے خوفزدہ ہوں؟ کیا میرے ماتحت مجھ سے خوف زدہ ہیں؟ کیا میں خوف کے ذریعہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں؟ کیا میں اپنی کامیابی کو ڈر کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟۔ آپ میں اگر اپنے آپ کو بے لاگ طور پر تجزیہ کرنے کی جراءت ہے تو اپنے آپ سے پوچھئے کہ آیا میں نے اپنے گھر سے ڈر کو دور کر دیا ہے۔ کیا میں مردانگی کو اپنے بچوں اور بیوی کے خلاف بطور ڈر استعمال کرتا ہوں؟ کیا میں اپنے گھر میں بات چیت میں گھر کا ماحول ڈر کی وجہ سے خراب کر دیتا ہوں؟ کیا میں دوسروں سے تابعداری کرانے کے لئے ڈر کا استعمال کرتا ہوں؟ بجائے گھر میں اعتماد اور محبت کی فضا کے؟

ڈر کا استعمال دراصل حیوانیت کی ایک قسم ہے۔ اور ہر ملک میں استعمال ہوتی ہے مگر یہ اچھے نتائج نہیں نکالتی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ خوف کی جگہ شرافت، پیار و محبت اور افہام و تفہیم سے کام لیا جائے۔

خوف کا تعلق جنگل، غار اور میدان جنگ کے ساتھ ہے۔ اور خوف کا جن انسانی فطرت کے تاریک گوشوں میں جگہ بناتا ہے۔ کسی ماں کو اپنے بچوں کو تاریکی سے ڈرانا نہیں چاہیے۔ خوفناک کہانیاں صرف دن میں اور بڑوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنی چاہیں۔ ہر ماں باپ کو اپنے بچوں میں سے خوف اس طرح نکالنا چاہیے جیسے کہ ایک مالی جڑی بوٹیاں پودوں میں سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اس طرح مذاہب کی تعلیم میں بھی جہنم کے ڈر کو اصلاح کے لئے استعمال کرنا کم کر دیا گیا ہے۔ بزنس اور گھر کی زندگی میں بھی ہم نے آہستہ آہستہ سیکھنا شروع کیا ہے کہ ڈر کی بجائے پیار و محبت اعتماد بہتر طریقہ ہے سکھانے کا اور اچھے نتائج کا۔

ہر بچے اور ہر بڑے میں ایک پوشیدہ جرات و ہمت ہوتی ہے جو کہ ابھارنی چاہیے۔ ہر شخص میں شیر اور چوہا دونوں موجود ہوتے ہیں اور بہتر یہی ہے کہ شیر کو باہر نکال کر کنٹرول دیا جائے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ یہی لیڈر شپ کا راز ہے کہ اپنے ڈر اور خوف پر قابو پایا جائے۔ اگر ایک آدمی دل میں بزدل اور ڈرپوک ہے۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو روح کا کیپٹن نہیں بنایا تو یہ بات یقینی ہے کہ اپنی زندگی کے نازک موڑ پر یا وہ شکست مان لے گا یا بھاگ جائے گا۔ ذہن سے ڈر نکالنے کے لئے کوئی دوائی ایجاد نہیں ہوئی لیکن ہمت، جرات، اور سخت کوشی پیدا کرنے کے آزمودہ طریقے ہیں۔ بہادروں کی کہانیاں پڑھیں۔ بہادروں کے ساتھ میل جول رکھیں۔ اور جس چیز سے آپ ڈرتے ہوں اس کو کر کے ڈر کر نکال دیں۔

اپنے آپ سے پوچھیں کہ ''سب سے خراب بات کیا ہوسکتی ہے۔'' کیا یہ غربت ہے؟ تو پھر کیا؟ کیا میں ان بڑے آدمیوں سے غریب تر ہوں گا جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ کیا یہ جیل میں جانا ہے؟ تو پھر کیا؟ کیا دنیا میں بڑے بڑے لوگ جیل میں نہیں گئے۔ کیا یہ سیکنڈل ہے؟ تو کیا بعض بڑے آدمیوں کو سیکنڈل میں نہیں گھسیٹا گیا۔ کیا یہ موت ہے؟ تو پھر کیا؟ کیا موت اتنی ہی حقیقی نہیں ہے۔ جتنی کہ زندگی؟ کیا یہ ہر

ایک کو نہیں آتی ؟ اگر موت نہ آئے تو کیا یہ غضب نہ ہو جائے گا ؟ میں اپنی زندگی کے قیمتی سال ایک ایسی چیز کے ڈر میں کیوں ضائع کر دوں جو کہ یقیناً آنی ہے۔ اس طرح کی سوچ سے انسان ایسی بلندی پر پہنچ سکتا ہے کہ کہہ سکے۔ ''یا پروردگار جو تمہیں پسند ہے وہ مجھے قبول ہے''۔

چوتھا باب

ہر انسان دوسرے کی نقل اتارتا ہے

بچہ اپنی ماں کی نقل اتارتا ہے۔ سب سے پہلے وہ وہی کام کرتا ہے۔ جو اس کی ماں کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ماں بچے کی نقل اتارتی ہے۔ اسی طرح باپ بہن بھائی سب ہی ایک دوسرے کی نقل اتارتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جو دوسرے کرتے ہیں وہ ان جیسا ہی کام کرتا ہے۔ اگر دوسرے ہنستے ہیں تو آپ بھی ہنستے ہیں۔ جیسے وہ خوش غمگیں، پر جوش، غصے ہوتے ہیں ویسے ہی آپ بھی ہوتے ہیں۔

اتنا بڑا اسچ سکولوں میں نہیں سکھایا جاتا۔ اور نہ ہی کوئی آدمی زندگی میں اس اصول کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ بچہ الفاظ کے معنی سمجھنے سے پہلے ہی نقل اتار کر الفاظ سیکھتا ہے۔ نقل اتارنا ہی دراصل تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ چیز بچپن کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ چھوٹا بچہ چلاتا ہے ''میں بھی'' جوان آدمی کہتا ہے۔ ''ہر ایک ایسے ہی کر رہا ہے'' ادھیڑ عمر آدمی کہے گا۔ ''یہی رسمی چیز ہے''۔

ہر عمر میں ہم گرگٹ کی طرح ہوتے ہیں کہ ہم اپنی رائے اور عادات ماحول کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ ہم ویسے ہی کرتے ہیں جیسے کہ دوسرے کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں ''مختلف'' ہونے سے ڈر لگتا ہے۔ یہ ڈر انسانی نسل کی بقا کے لئے ضروری تھا تا کہ سب ایک ہی جیسے لگیں اور ایک ہی جیسے رہ سکیں۔ مثلاً جب زولو قبیلہ کے لوگ ایک ہی جیسا لباس پہنتے تھے، ایک ہی جیسا رنگ کرتے تھے تو وہ ایکدوسرے کو آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ اگر کسی نے اس سے مختلف لباس پہنا ہوتا تو وہ بآسانی بطور دشمن شناخت کیا جا سکتا تھا اور مارا جا سکتا تھا۔

نقل قبیلہ کی بقا، اتحاد اور پہچان کا ذریعہ تھی اس کے ساتھ ہی اس سے انقلابی تبدیلیوں سے بچا جا سکتا تھا۔ یہی تعلیم کا ذریعہ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی میں رکاوٹ بھی۔ اور آج کل بھی ترقی میں رکاوٹ یہی نقل بنتی ہے۔ کہ معاشرہ ایک خاص طرز عمل، لباس، وغیرہ پر اصرار کرتا ہے۔ ہم فیشن کے اثرات کو بخوبی جانتے ہیں۔ صدیوں پرانے لباس میں کون باہر نکالنے کی جرات کرے گا۔ لوگ وہی کرتے ہیں جو دوسرے کرتے ہیں۔ وہ وہیں جاتے ہیں جہاں دوسرے جاتے ہیں۔ وہ وہی پہنتے ہیں جو دوسرے پہنتے ہیں۔ وہ وہی کہتے ہیں جو دوسرے کہتے ہیں۔ وہ اسی طریقے سے سوچتے ہیں جیسے دوسرے سوچتے ہیں۔ یہ نقل کا اصول ہے۔

فطرتاً ہم اجنبی لوگوں کو پسند نہیں کرتے اور نہ ہی نئے خیالات یا نئی عادات کو۔ اس لئے انگلینڈ میں بوڑھی عورتوں کو جادوگرنی سمجھ کر مار دیا جاتا تھا۔ مذہبی اختلاف پر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ جو بھی کوئی نئی چیز شروع کرتا ہے وہ خطرہ میں ہوتا ہے۔ ہر نیا انداز اختیار کرنے والا یا تو شہید بنا دیا جاتا ہے یا پھر دیوالیہ۔ انڈریو کارنیگی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ Pioneering کبھی نفع نہیں دیتی۔

عوام الناس کی رائے ہمیشہ ایک ہی رنگ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس نے مصر کو پتھر میں تبدیل کر دیا۔ روم میں قدرے کمی آ گئی اس کے زور میں۔ اور انگلینڈ میں اس کا زور بہت ہی کم ہے۔ مگر ہے ضرور۔ Non-conformist بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے اگلی نسل پھر نقل پر اتر آتی ہے۔ ہم سب نقل کی قوت میں زود یا دیر سے پکڑے جاتے ہیں۔ اسی کی قوت سے سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں۔ دوسری سوسائٹیاں اور مذہبی فرقے۔ یہ سب دراصل پرانے طریقوں کو بچاتی بھی ہیں۔ کوئی آدمی کبھی علیحدہ یا اکیلا نہیں رہ سکتا۔ شہد پالنے والے نقل کو ''چھتے کی روح''' کہتے ہیں۔ یہ قوم پرستی کا ایک جزو ہے۔ نقل ہی گھر کی خوشیوں میں اضافہ کرتی ہے۔ یا پھر کسی کارخانے، یا قوم کی قوت میں اضافہ کرتی ہیں۔

جب کسی اجتماع میں تمام لوگوں ہزاروں کی تعداد میں ایک ہی بات پر تالی بجاتے ہیں یا ایک ہی لطیفے یا خیال پر ہنستے ہیں تو کیا یہ باعث اطمینان نہیں ہوتا کہ سب کی سوچ ایک جیسی ہے اور وہ سب ایک دوسرے میں پروئے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ ایک اچھے مقرر کی موجودگی میں ایک انسان کی طرح بن جاتا ہے یا ایک جسم کی طرح۔ جس کو ہر ایک محسوس کر سکتا ہے کہ وہ سب ایک ہیں۔ ہر ایک ذرہ مل کر ایک مجموعہ بن جاتا ہے۔ اسی لئے ایک اچھا مقرر سب کا آقا بن جاتا ہے۔ اگر آپ سب میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اجتماعی میٹنگ ضرور بلائیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں۔ آپ ان سب کو اکٹھا ہنسا سکتے ہیں۔ تالیاں بجوا سکتے ہیں۔ اور نقل کے طریقے کو استعمال کر کے باہمی اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم نے آرمی یا فوج کیسے بنائی؟ پہلے ان کے ذہن میں ایک ہی خیال ہو۔ ایک ہی جیسی قوت۔ ایک ہی جیسے جذبات اس طرح ہم نے ان کی نقل کی فطرت کو ابھار کر ان کو ایک بنا دیا۔ کیا پھر تمام مینیجر، تمام افسروں کے لئے یہ درست سبق نہیں ہے؟ جبکہ ان کو تمام لوگوں کے اجتماع سے لین دین کرنا ہو۔ سٹاف ٹریننگ کے پیچھے یہی نقل کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ اگر آپ ٹیم بنانا چاہتے ہیں اور اپنے ورکروں سے وفاداری چاہتے ہیں تو پھر ان کو اکٹھا پڑھائیں تاکہ وہ ایک ہی جیسی باتیں سیکھیں اور کریں۔ ذاتی ٹیوشن کسی کلاس یا اجتماعی تعلیم کی جگہ نہیں لے سکتی۔ زیادہ تر لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر سیکھتے ہیں۔ ان کو پڑھایا نہیں جاتا بلکہ وہ ایک دوسرے سے چیزیں سیکھتے ہیں۔ اور عام طور پر یہ سارا غلط ہوتا ہے کیونکہ بجائے مکمل اور صحیح طور پر سیکھنے کے وہ ایک دوسرے سے صرف چھوٹے چھوٹے حصے سیکھتے ہیں۔ مثلاً احمد نے محمود سے سیکھا۔ محمود نے اسلم سے اور اسلم نے اشرف سے اور اشرف کو پوری طرح آتا نہ تھا۔ اس طرح ایک ادھوری بات سب تک پہنچ گئی۔ اور اس طرح بعض اوقات نسلوں کی نسلیں غلط بات کو صحیح مانتی رہتی ہیں۔ اس طرح کی نقل سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔ اس کا آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس طرح تجارت میں بھی نقل سے ہی قومی عادات بنتی ہیں۔ مثلاً اشتہارات سے اس چیز کو اصل، قیمتی اور درست شئے قرار دیا جاتا ہے جس کی لوگوں کو تلاش ہوتی ہے۔ اس طرح بڑی دکان، بڑے لوگوں کے استعمال سے بھی وہی درست چیز قرار دی جاتی ہے۔ اسی طرح صحیح قیمت سے بھی وہی درست قرار دی جاتی ہے۔ کیونکہ زیادہ لوگ اس کو استعمال کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اشتہارات اسی اصول پر کام کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ کہ ہم بھیڑ بکریوں کی طرح ہیں۔ اگر آپ کے پاس نیا خیال ہے یا نئی چیز تو اس کو کبھی بھی بالکل نئی چیز نہ بنائیں۔ اس لئے کہ لوگ بالکل نئی چیز کے خریدنے سے کتراتے ہیں۔ کیونکہ جب تک لوگ آزما کر اسے اصل حقیقی چیز قرار نہ دیں۔ زیادہ لوگ خطرہ قبول کرنا پسند نہ کریں گے۔ مثلاً ٹیلیفون انگلینڈ میں سائنسی کھلونا کہلاتا تھا۔ اور لوگوں نے اس کی طرف بالکل توجہ نہ دی جب تک ایک جج نے غلطی سے اس کو ٹیلیگراف کا نام نہ دیے دیا۔ تب لوگوں نے سوچا کہ یہ کام کی چیز ہو سکتی ہے۔ اگر آپ بہت ہی جدت پسند ہیں تو لوگ آپ کی موت کے بعد ہی آپ کی تعریف کریں گے۔ اگر آپ دولت اور شہرت کمانا چاہتے ہیں تو پھر اپنی جدت پسندی کو لوگوں کی پسند کے مطابق ڈھالیں۔ میرا خیال ہے کہ پرانی چیز کے ساتھ تھوڑا سا نیا خیال ڈال دیا جائے تو پھر وہ قابل قبول ہو جاتا ہے۔ مثلاً کیا آپ کی بیٹی نیا لباس پہن کر اور خوبصورت نہیں لگتی؟ آپ نقل کے اصول کو اپنائیں، استعمال کریں اور نظر انداز بالکل نہ کریں۔ اگر آپ امیر بننا چاہتے ہیں یہ آپ کو امیر بنا سکتا ہے۔ کوئی بھی آدمی اتنا جدت پسند نہیں ہوتا جتنا وہ سمجھتا ہے۔ اور اگر وہ ہے تو یہ اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اگر وہ اس نسل کا پروردہ ہے تو اس نسل سے وہ اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر آپ اپنی نسل کے خیالات، مذاق، لباس وغیرہ نکال دیں تو آپ میں کیا رہ جائیگا؟ بہت کم۔ عموماً یہ اچھی پالیسی ہیکہ غیر ضروری چیزوں میں دوسروں کی نقل کی جائے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں جدت پسند بن کر بیوقوف نہ بنیں۔ بڑی چیزوں میں جدت پسندی کو پرانی چیزوں کے ساتھ ملائیں۔ یاد رکھیں، اتنے تیز نہ چلیں کہ دوسرے لوگ آپ کے ساتھ نہ چل سکیں۔

پانچواں باب

ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے

لوگ ایک دوسرے سے اتنے مختلف نہیں ہوتے جتنے کہ وہ سمجھتے ہیں۔

اس کتاب کے لکھنے کا مطلب اور مقصد ہی یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ انسانی فطرت کا تفاوت اتنا ضروری نہیں ہے جتنا کہ اس کی یکسانیت۔تقریباً ہر آدمی یہی سوچتا ہے کہ وہی اس دنیا میں یکتا ہے۔ ہر وہ شخص جو تھوڑی سی بھی جدت پسندی رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو مختلف محسوس کرتا ہے۔اور اس چیز کا اسے احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ دوسرے سے مختلف ہے۔

مجھے تقریباً ہر بزنس مین نے یہی کہا ہے کہ اس کی تجارت کا طریقہ دوسرے سے مختلف ہے۔اور عام اصول اس پر منطبق نہیں ہوتے یہ کہنا یا سمجھنا دراصل ایک دھوکہ اور ذاتی فریب ہے۔ یہ صرف ایک حد تک درست ہے جیسا کہ میں اس باب میں آپ کو دکھلاؤں گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم اپنی فطرت کے اس چھوٹے سے حصے کا تو احساس کر لیتے ہیں جو دوسرے سے مختلف ہے۔مگر اس بڑے حصے کا نہ احساس کرتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔کہ ہمارا زیادہ حصہ عام انسانوں کی طرح معمولی ہے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہر بزنس میں صرف 15 فی صد حصہ مختلف ہوتا ہے۔اور 85 فیصد عام اصولوں کے مطابق ہوتا ہے۔اسی طرح ایک انسان 5 فی صد سے زیادہ دوسروں سے مختلف نہیں ہوسکتا بلکہ بڑے بڑے لوگ بھی زیادہ سے زیادہ 40 فیصد تک مختلف ہوتے ہیں۔ باقی 60 فیصد عام لوگوں جیسے ہوتے ہیں۔اگر کیمیائی لحاظ سے تجربہ کیا جائے تو وہ 0001. فیصد سے بھی زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔اگر ایک آدمی صرف ایک انچ مختلف ہو تو وہ اسے مبالغہ سے ایک میل مختلف سمجھے گا مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ ایک انچ مختلف ضرور ہے اور یہی حقیقت ہر لیڈر اور مینجر کے لئے جاننا اور ماننا ضروری ہے۔

فطرت سے کوئی بھی دو چیزیں یکساں نہیں ہوتیں مثلاً دو پھول، دو گھاس کے پتے، یا برف کے گولے۔قدرت یکسانیت نہیں چاہتی بلکہ وہ اپنی ہر پیداوار پر مختلف ہونے کی مہر ضرور لگاتی ہے۔جسمانی طور پر انگوٹھے میں اس کی شناخت کا سامان کر دیا جاتا ہے۔انگوٹھے کے نشان ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں اور پولیس عام طور پر انہی سے شناخت کرتی ہے۔

اختلاف دراصل ذہنی طور پر زیادہ ہوتا ہے جبکہ انسان اپنی جسمانی ساخت میں بہت کم مختلف ہوتے ہیں۔ذہنی لحاظ سے اس سے زیادہ اور جذبات میں سب سے زیادہ اختلاف ہوتا ہے۔ دو آدمی ایک طرح سوچ سکتے ہیں مگر ایک ہی جیسا محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت انتہائی واضح ہے۔

اگر آپ کے پاس تاز کے پتوں کی پانچ کوئین ہوں تو اس کے ساتھ 7776 ممکنات ہوتی ہیں۔کہ آپ صرف ایک دفعہ ہی پانچ چھ ڈال سکیں گے۔اگر آپ کے ذہن میں پانچ ارب سیل ہوں تو پھر ان میں اکھٹے ہونے کے کتنے ممکنات ہوں گے، آپ خود ہی اندازہ لگالیں۔

لوگ کاروں کی طرح نہیں ہوتے۔ کہ سب ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔اور ایک کا پارٹ یا حصہ دوسرے میں آسانی سے لگ سکتا ہے۔ انسانوں میں جسم، ذہن، دل تینوں میں فرق ہوتا ہے۔خاص طور پر دل میں۔جیسے کہ فطرت میں دو قوتیں ہوتی ہیں۔جبکہ ایک جو مرکز کی طرف کھینچتی ہے اور دوسرے جو مرکز سے باہر کی طرف۔اسی طرح ہر انسان میں نقل اور جدت پسندی کی دونوں قوتیں اور صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ہم ان دونوں میں

سے ایک کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور اعتدال کے لئے ضروری ہے کہ دونوں ہی کو استعمال کیا جائے تبھی جا کر صحیح کریکٹر اور شخصیت بنتی ہے۔

Centrifugal قوت جو مرکز سے باہر کی طرف کھینچتی ہے۔ یہی لوگوں میں جھگڑے، مقدمے اور جنگ کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس سے ہی ذہین، دھوکہ باز، فریب، لالچ والے اور Genius پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے مجرم، پاگل، موجد، آرٹسٹ، جوگی پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے ہی انسانی صلاحیتوں کا بہترین اور بدترین حصہ سامنا آتا ہے۔

ہم دوسروں سے اس لئے مختلف ہونا چاہتے ہیں کہ اس سے ہمیں دوسروں پر برتری کا احساس ہوتا ہے۔ ہماری Self Respect ذاتی عزت عموماً دوسروں کے لئے نفرت کے باعث ہوتی ہے۔ نہ کہ اپنی اچھائیوں پر۔ ہم دوسروں کو نیچ ثابت کر کے اپنے آپ کو مختلف اور بہتر گردانتے ہیں۔ بجائے اپنی اچھائیاں کرنے کے بعد۔ اسی لئے بوڑھے جوانوں کو برا کہتے ہیں اور جوان بوڑھی نسل کو۔ امیر غریب سے نفرت کرتا ہے۔ اور غریب امیر سے۔ زاہد دنیاوی خوش حال سے ناراض ہے۔ اور خوش حال لوگ زاہد سے تنگ۔ یعنی آپ کے نقطہ نظر سے کوئی دوسرا صحیح نہیں ہوتا۔ صحیح وہی ہوتا ہے جو آپ جیسا سوچے یا کرے۔ آپ اپنے آپ کو سٹینڈرڈ سمجھ لیتے ہیں۔ جس کے ساتھ مقابلہ کر کے صحیح یا غلط کا اندازہ لگایا جائے۔ اگرچہ یہ ناانصافی ہے مگر کیا ہم سب اسی طرح نہیں سوچتے؟ ہماری باتوں کے موضوعات میں عموماً ان لوگوں کے لئے جو ہم سے مختلف عادات رکھتے ہیں۔ نفرت کے جذبات نہیں ہوتے؟ یا کم از کم ہم ان کا مذاق نہیں اڑاتے۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ ہم سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اسی اختلاف میں مزا ہے۔ جیسے کہ میں نے پچھلے باب میں بتایا تھا کہ نقل سے ہی ''کند جنس باہم جنس پرواز'' ہوتی ہے۔ ایک ہی قسم کے پرندے اکھٹے رہتے ہیں۔ اگر دوسری قسم کے پرندے آ جائیں تو وہ ان پر حملہ بھی کر دیں گے۔ اسی طرح انسان ہیں۔ کہ مزدور آجر سے ناراض ہے آجر مزدور سے۔ بعض لوگوں نے کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک چھوٹا سا انسان اپنی زندگی کے بارے میں ایسا جذباتی خیال رکھ سکتا ہے کہ وہ ہر جذبے اور خیال کو نظر انداز کر کے خیالی زندگی گزار سکتا ہے۔ میرا تو یہ تجربہ ہے کہ کوئی بھی انسان اپنی ضروریات، مقاصد کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے ایسا خیالی انسان ناممکن ہے۔

شعور ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے۔ اور ذاتی شعور کا مطلب ہوتا ہے۔ ''میں''۔ ''میرا''۔ اس شعور کی اچھائی کا انحصار ہر انسان پر علیحدہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک حبشی کا اپنے آپ کے بارے میں شعور مختلف ہوگا۔ بہ نسبت ایک تہذیب یافتہ آدمی کے مقابلے میں۔

Descartes ڈسکارٹس جو ایک عظیم فلاسفر تھا۔ اس نے بھی جب رسوم کو چھوڑ کر سوچنا شروع کیا۔ تو اس کی بنیاد اس سوچ پر تھی کہ ''میں سوچتا ہوں اس لئے میں میں ہوں'' اس کی رائے میں فلاسفی شروع ہی مختلف ہونے کے احساس و شعور سے ہوتی ہے۔ اور سب سے پہلا خیال یہی آتا ہے کہ ہر انسان مختلف ہے اور یکتا ہے۔ اسی طرح تمام نسلیں اپنے آپ کو بہترین کہتی ہیں۔ حبشی قبائل بھی یہی سوچتے ہیں لندن والا بھی اور تبت کا رہنے والا بھی۔

ذاتی غرور، ذاتی رحم، ذاتی ارادہ کی قوت، ذاتی منافع، ہی دراصل مجرموں اور پاگلوں کی بنیاد بنتا ہے۔ جب ان جذبات کو حد سے بڑھا دیا جائے کہ ''دوسرے جائیں جہنم میں۔ مجھے میرا مقصد حاصل ہونا چاہیئے''۔ یہی خیال دنیا میں انسانوں قوموں کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ بزنس میں بھی یہی جذبہ ہوتا ہے مگر کم درجے کا۔ تجارتی زندگی میں آ کر انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ہم دوسروں کے ساتھ رہنا سیکھتے ہیں اور دوسروں کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں۔ اگرچہ بزنس میں بہت ہی لالچ اور خود غرضی ہوتی ہے مگر اس میں تشدد یا مجبور کرنا نہیں ہوتا۔ یہ دو طرفہ مفاد پر انحصار کرتا ہے۔ سیلز مین کو لے لیجئے۔ اس کی صرف یہی صلاحیت کافی نہیں کہ وہ آپ کی توجہ کو مرکوز کر کے آپ کو چیز بیچے یا آپ کو اپنی ضرورت کا احساس

دلا کر چیز بیچے بلکہ اسے اپنی چیز کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔خریدار کی شخصیت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔اور پھر ہر خریدار کی ذاتی پسند کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر وہ کوئی چیز بیچ سکتا ہے۔

اسی طرح ہر فیکٹری میں ہر مشین ایک جیسی ہوتی ہے مگر اس مشین کے پیچھے ہر انسان مختلف ہوتا ہے۔اور فورمین کو اگر کام لینا ہے تو وہ ہر ایک کے ساتھ مختلف رویہ رکھے گا، سب کو خوش رکھنے کے لئے۔ ہر کامیاب فورمین کو اس کا تجربہ ہے۔

انسانی فطرت کا مطالعہ ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ ہر فیکٹری میں ایک ڈیپارٹمنٹ ہونا چاہیے۔ جو ہر انسان کو پرکھے اور ان کو ٹریننگ دے۔بعض لوگ بعض کاموں کے لئے مناسب ہوتے ہیں اور موزوں۔اس لئے ہر آدمی کو اس کے موزوں کام پر لگانا چاہیے نہ کہ کام کو مزدور کے موافق۔مینیجر کو ہر سٹاف ممبر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔تا کہ وہ تمام کاموں کو Co-ordinate کر سکے۔ان سب کے کام میں مقصد کو شامل کیا جائے۔ وہ فورمین، کلرک اور سیلز مین کو ایک ہی چیز سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتا مگر ان کے اختلاف کو سسٹم میں اس طرح پرو سکتا ہے کہ ہر ایک کا بھلا ہو۔مینیجر ایک دوسرے سے ہمدردی اور لطیف جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایک حصہ کو دوسرے حصے کی مجبوریوں اور مشکلات کا احساس دلا سکتا ہے۔ وہ تمام لوگوں میں کمپنی کا نقطہ نظر پیدا کر سکتا ہے۔اور یہی نقطہ نظر پیدا ہونے سے اس کے سب مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

ہر انسان اعتقاد رکھتا ہے

شاید آپ نے دیکھا ہوگا کہ پہلے پانچ ابواب کو بڑھا کر ہر ایک پر ایک نئی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اعتقاد پر تو پوری لائبریری بنائی جاسکتی ہے۔ حقیقت میں لائبریریوں میں کتابیں عموماً اعتقادات پر ہوتی ہیں، حقائق پر بہت کم مبنی ہوتی ہیں۔

ہر ایک انسان عقیدہ رکھتا ہے۔؟ کیوں۔؟ اس لئے کہ مان لینا، عقائد رکھ لینا معلوم کرنے سے بدرجہا آسان ہے۔ عقیدہ کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال کا آسان حل یا جواب ہوتا ہے؟ جب ایک آدمی ایک چیز نہیں جانتا تو پھر وہ کیوں نہیں کہتا کہ میں نہیں جانتا۔ اس سوال کے جواب میں میں خود ہی کہوں گا کہ مجھے اس کا جواب پتہ نہیں کیونکہ یہ انسانی فطرت کے بھیدوں میں ایک بھید ہے جس کا ابھی کھوج نہیں ملا۔

اگر لوگ علم کی واقعی قدر نہیں کرتے، خواہش نہیں رکھتے تو پھر وہ کیوں کہتے ہیں کہ وہ علم رکھتے ہیں جبکہ وہ نہیں رکھتے۔ اور اگر علم کی واقعی قدر کرتے ہیں تو پھر اس کو تلاش کیوں نہیں کرتے۔؟

آدمی کی حفاظت اور ترقی کے راز کو علم پر مبنی رکھا گیا ہے۔ تو پھر اس کی فطرت کیوں ایسے بنائی گئی ہے۔ کہ وہ صرف کہانیوں پر یقین کر لیتا ہے، بہ نسبت حقیقتوں کے۔ آدمی کے تخیلات اتنے طاقتور کیوں ہیں اور عقل اتنی کمزور کیوں ہے؟

ماضی میں عقائد کو بچاتے ہوئے لاکھوں آدمیوں نے جانیں قربان کر دیں حالانکہ وہی عقائد آج غلط ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً! Epictifus کا خیال تھا کہ کوّے کو کاٹ کر اس کی آنتوں کے مطالعہ سے مستقبل کی خبر دی جاسکتی ہے۔ Marcus Hurelius کا عقیدہ تھا کہ Zeus میں بہت طاقت ہے۔ آج کل کے عملی آدمی بھی مختلف عقیدے رکھتے ہیں۔ مثلاً جمعہ، اوپل، مور کے پر، 13 کا ہندسہ بدقسمت گنا جاتا ہے۔

حبشیوں کے پاس مشکل سوالات کا ایک ہی جواب ہے ''روح نے کیا ہے'' سورج گہن، سورج دیوتا کے غصہ کی وجہ سے ہے۔ زلزلہ اس لئے آتا ہے کہ چاند اور سورج جھگڑ پڑے ہیں۔ اگر بدہضمی ہوگئی ہے تو روح پیٹ کے اندر چلی گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیں حبشیوں کے عقائد۔ اب تک دنیا میں جن، بھوت، چڑیلیں، اور پریاں رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی خیالی مخلوقات تھیں۔ بدروح اور اچھی روح میں جنگ جاری رہتی تھی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں پر قبضہ جما سکیں۔

پارک گاڈون نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے بچپن میں کئی بوڑھی عورتوں کی طرف اشارہ کر کے اسے بتایا گیا تھا کہ یہ جادوگرنیاں ہیں۔ یہ سب نیویارک میں تھا۔ امریکہ کے شہر سالم میں 27 عورتوں کو جادوگرنیاں سمجھ کر زندہ جلا دیا گیا۔ 1000 بوڑھی عورتوں کو چڑیلین یا جادوگرنیاں سمجھ کر اٹلی میں جبکہ 7000 کو Treves میں زندہ جلا دیا گیا۔ جادوگرنیاں تقریباً تمام ملکوں میں بری نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ 1500 سال تک کسی کو بھی اس کا خیال نہ آیا کہ یہ سب غلط تھا۔

مگر یاد رکھیں کہ اب بھی ہم اس کو بھولے نہیں۔ اب صرف ظالمانہ طریقوں کی بجائے شریفانہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ اور اب اس کا نام جادوگری کی بجائے روحانیت اور کرسچئین سائنس رکھ لیا گیا ہے۔ کرسچن سائنس کا عقیدہ ہے کہ بیماریاں دراصل گناہوں کا خمیازہ ہیں یعنی یہ سب ذہنی اثرات کی وجہ سے ہیں۔ اور یہ کہ ان کا علاج صحیح ذہنی رویہ ہے۔ یہ بھی پرانا انداز ہی ہے مگر اس میں بہتری یہ ہے کہ یہ صحیح ذہنی رویہ اختیار کرنے

پر ابھارتا ہے، بجائے منفی رویہ کے جو جادوگری پر مبنی تھا۔ آج کل کے دور میں ہمارے عقائد مذہبی یا روحانی ہونے کی بجائے سوشل، سماجی، انڈسٹریل یا سیاسی ہوگئے ہیں۔ یعنی جو عقائد ہم پر حکومت کر رہے ہیں وہ گھر، سکول، دفتر، سوسائٹی کے عقائد ہیں۔

Superstitions ختم نہیں ہوئی۔ اس کی نئی شکلیں نکل آئی ہیں۔ یہ سیاسی، سماجی رسوم کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک غیر واضح خوف ہوتا ہے کہ اگر یہ چیز کہی یا نہ کی گئی تو کچھ نقصان ہوگا۔ یہ عقیدہ ہے جو صرف خوف یا جذبات یا رسم کی وجہ سے بن گیا ہے اور یہ ہر بزنس میں آ گیا ہے۔

انسانی فطرت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر صدیوں پرانی فطرت سے آج کل بھی یہ کوئی خاص بہتر نہیں ہوئی اور پرانی فطرت پھر ابھر کر آ جاتی ہے۔ ان عقائد کو جو کہ اب قابل قبول نہیں رہے۔ ہم Superstitions کا نام دیتے ہیں۔ مگر موجودہ عقائد کو ہم نے Public Opinion کا نام دے دیا ہے۔ اور ہم سب اس سے ڈرتے اور اس کو مانتے ہیں۔

ایک آدمی اپنے دادا کے غلط عقائد کو پہچان لے گا مگر اپنے عقائد کو نہیں پہچان سکتا کیونکہ وہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ اس کی قوت کو محسوس نہیں کرتا۔ اگر وہ اس کے مخالف سمت چلنے لگے تو پھر اس کو اس کی قوت کا اندازہ ہوگا۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ارسطو آج قابل قبول ہوگا تو کسی بھی فیکٹری میں جا کر کیوں۔ کیسے کا سوال پوچھیں، پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مینیجر سے لے کر مزدور تک سب کی حفاظت ان عقائد کے مطابق کام کرنے میں ہے جس کے مطابق وہ کام کر رہے ہیں۔ کام کو بہتر بنانے کے لئے آپ کیوں کیسے کا سوال پوچھ لیں پھر دیکھیں وہ کیا سلوک کرتے ہیں۔؟ حالانکہ اس سوال پوچھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ فیکٹری کے کام کرنے کے طریقے کو بہتر بنایا جائے مگر کیا کیا جائے کہ ہر ایک آدمی کو غلطی سے یہ خیال اور یقین ہو جاتا ہے کہ ایسے سوالوں کا مطلب دراصل لوگوں کو کام سے نکال دینے کی طرف پہلا قدم ہے۔ لوگوں کا یہ خیال اور عقیدہ کسی پسماندہ ملک میں نہیں بلکہ امریکہ، انگلینڈ میں ہے جو اپنے آپ کو بڑا ترقی یافتہ سمجھتے ہیں۔

ہر ایک چیز ناممکن ہوتی ہے جب تک کر نہ لی جائے۔ لوگوں کے عقائد اتنے سخت ہوتے ہیں کہ سائنسی طریقہ اختیار کرنے سے ہر قدم پر مخالفت ہوتی ہے اور بڑھنے کے لئے بڑی مشکل سے راستہ ہموار کیا جاتا ہے۔ آج تک یہی سلسلہ رہا ہے۔ اور آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔ ہر ایک کارخانے والا ایک عقیدہ بنا لیتا ہے۔ مثلاً میرے کاریگر بڑے وفادار ہیں اور فرمانبردار۔ یا میرے فورمین بہت ہی لائق ہیں۔ میرے خریدار میرے مال سے خوش ہیں۔ ایسے ہی عقائد کاروبار کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کی جگہ سائنسی طریقہ سے تجارت کا انتظام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جیسے کہ کیمیا، فزکس وغیرہ میں کی گئی ہے۔

عقائد آہستہ آہستہ ٹوٹ رہے ہیں۔ اور تمام عقل مند آدمی اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔ کہ عقائد صرف ذہن کی پیداوار ہیں۔ ہم دو اور دو چار میں عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ جانتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے۔ اس طرح ہوائی جہاز کا اڑنا، موٹر کار کا چلنا، سب حقیقتیں ہیں۔ عقائد نہیں۔ اس لئے ہر ایک کو اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہیے کہ کیا میں اپنے کام عقائد کے سہارے کر رہا ہوں یا علم کی روشنی میں۔ کیا میرا ذہن مختلف آراء یا Opinion کے ساتھ کام کرتا ہے یا علم کے ساتھ، حقیقت کے علم کے ساتھ۔ Descarts، فرانسیسی ماہر نے 1637ء میں عقائد کو ٹسٹ کرنے کے لئے چار اصول بنائے تھے۔ وہی اصول ہم اپنی زندگی میں ہر کام کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے سائنسی طریقہ نے جنم لیا۔ وہ یہ ہیں۔

1 کسی چیز کو بھی صحیح نہ مانا جائے جب تک مجھے اس کے سچ ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔ اور اس سلسلے میں میں اپنی رائے کو بالکل وقعت نہ دوں۔

2 ہر مشکل کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا جائے جتنا ممکن ہو سکے۔

3 خیالات کے سلسلے کو ایک ترتیب سے شروع کیا جائے تا کہ آسان سے مشکل کی طرف بتدریج بڑھا جائے۔ ہر تحقیق میں حساب کتاب اتنا بڑا ہو کہ کچھ رہ نہ جائے۔ تو اس دنیا میں اگر ہم نے ترقی کرنی ہے تو تمام عقائد کو چیلنج کرنا پڑے گا۔ اور ان کی جگہ حقیقت کی تلاش کرنی پڑے گی۔ ہمیں اپنی رائے کو اس کی اصل جگہ دینی چاہیے اور صرف سچ پر اعتبار کرنا چاہیے۔

ہرانسان سوچتا ہے

جیسے کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ ہرانسان میں دوقوتیں ہوتی ہیں۔ایک Centripetal یا مرکز یہ اور Centrifugal مرکز گریز۔ ایک کا مقصد ذاتی حفاظت ہے۔اور دوسری کا نسل کا بقا۔ یہ دونوں مقاصد ہی آدمی کے اعمال کے محرکات ہوتے ہیں۔ایک کا مطلب ہے میرے اپنے بارے میں جذبات، اور دوسری کا مطلب ہے میرے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں جذبات۔ دونوں ہی فطری ہیں۔ دونوں ہی اچھے ہیں اور عقل مندی والے۔ برائی تب شروع ہوتی ہے جب ان میں اعتدال یا انصاف نہیں رہتا۔ جب انسانی فطرت کو عادات میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ براہمیشہ وہ ہوتا ہے جو کہ غیر قدرتی غیر ترقی یافتہ ہو۔اس کی تشریح بعد میں آئے گی۔

انسانی فطرت وہی ہے جو زمین کی فطرت ہے یعنی قوت مرکز یہ اور غیر مرکز یہ۔ کشش اور نفرت یا ذات اور سوسائٹی! جدت پسندی اور نقل! سوچ اور عقائد!۔ہم اور آپ ستاروں کی طرح ہیں۔ ہم صرف اس سرزمین پر ہی نہیں رہتے ہیں بلکہ ہم اسی سرزمین کا ایک حصہ ہیں۔اسی سرزمین نے ہمیں ایسے ہی جنم ہی دیا ہے جیسے کہ سیپی سے موتی نکلتا ہے۔اس میں ہی وہ سب سے بڑا راز ہے۔اور ایسی حقیقت جو چند ذہن ہی قبول کر سکتے ہیں۔کیا یہ سرزمین سوچ سکتی ہے؟نہیں! مگر یہ وہ چیزیں پیدا کرتی ہے جو سوچ سکتی ہیں۔کیا موتی سیپی کی طرح ہوتا ہے۔؟ کیا عقاب اس انڈے کی طرح ہوتا ہے جس سے وہ بنتا ہے۔ہم اس سرزمین کے بھیدوں کو نہیں جان سکتے۔

ہرآدمی سوچتا ہے۔ یہ مرکز یہ قوت کا کرشمہ ہے۔ یہ ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ جتنا زیادہ آدمی سوچے گا۔اتنا ہی وہ نقل کم کرے گا۔ جتنا زیادہ آدمی سوچے گا۔اتنا ہی وہ دوسروں سے مختلف ہوتا جائے گا۔نقل سوشل عمل ہے جبکہ سوچنا سوشل عمل نہیں۔سوچ صرف سوچنے والے کے لئے ہی ہوتی ہے۔سوچ ایک آدمی کو دوسرے سے علیحدہ کر دیتی ہے۔اسی وجہ سے غالباً فلاسفروں، موجدوں، سوچنے والوں کو لوگ ہمیشہ صلیب پر لٹکاتے آئے ہیں۔اس لئے کہ سوچ مرکز یہ ہے۔اپنی ذات کے مرکز کی طرف مائل کرتا ہے۔

سوچ آخر کار عوام کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے مگر عوام اس بات کو بہت دیر سے سمجھتے ہیں۔ پہلے مرحلے پر تو وہ سوچنے والوں سے گھبراتے ہیں اور خوف کھاتے ہیں۔ان کو سماج کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس کی مخالفت کر کے اسے ختم کر دیتے ہیں۔ جب اس کی سوچ کے فوائد کی سمجھ آتی ہے تو پھر اس کی یاد میں مجسمہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

انسانی ذہن بنیادی طور پر جسم کی حرکات کو کنٹرول کرنے کے لئے ہے۔اسے دماغی سوچ بورڈ سمجھ لیں۔ جو کہ انسانی اعصابی نظام کو کنٹرول کرتا ہے۔کہاں سے دماغ شروع ہوتا ہے اور کہاں سے ریڑھ کی ہڈی، کوئی بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ دماغ ریڑھ کی ہڈی سے نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ریڑھ کی ہڈی کے اوپر Module Oblongate ہوتا ہے جو کہ عمودی طور پر بڑا ہوتا ہے۔اور یہی جسم کی خودکار حرکت کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ غالباً دماغ کی پہلی شکل ہے۔اس دماغ کے اوپر اور پیچھے کی طرف Cerebellium ہے۔ جو کہ چھوٹا دماغ ہوتا ہے۔اس کا مقصد دماغ کے شعوری افعال کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے لیکن یہ دماغ سوچنے والا حصہ نہیں ہوتا۔اگر آدمی کے پاس صرف یہ دو حصے ہوں تو وہ انسان نہیں ہوگا۔

اصل دماغ یا سوچنے وال حصہ دراصل اوپر والا بڑا حصہ ہوتا ہے۔جس کو ہم Cerebrum کہتے ہیں۔ یہی وہ حصہ ہے جو ہمیں انسان بناتا ہے۔اور حیوانوں سے متمیّز کرتا ہے۔ یہ اربوں اعصابی سیل پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کو (Grey Matter) کہتے ہیں۔ جبکہ اعصابی

Nerve Fibres کو White matter کہتے ہیں۔

دماغ کے اس حصہ میں ہی خودی اور انا ہوتی ہے۔ یہیں پر جذبات، خیالات، خواہشات، خوف، فیصلے وغیرہ شعوری حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ یہیں پر خودی ہوتی ہے یا جو کچھ بھی آپ ہیں۔ اور یہیں حواس خمسہ سے آمدہ اطلاعات کو پرکھا جاتا ہے۔ حواس خمسہ کو پانچ راستے سمجھ لیں۔ اور ذہن کو سٹور کی طرح۔ تمام احساس جو کہ حواس خمسہ سے جنم لیتے ہیں، اس سٹور میں آتے ہیں۔ یہاں پر ان کو پرکھا جاتا ہے۔ ان کو دوسرے اور پہلے تجربات سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اور پھر حافظہ میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس تمام عمل کا نام ہی سوچ ہے۔ یعنی مشاہدہ کرنا اور مقابلہ کرنا! ان چار الفاظ میں سوچ کی اصل بیان کر دی ہے۔ یعنی پہلے مشاہدہ کرنا۔ اور پھر اس کا پہلے تجربات سے تقابل کر کے نتیجہ اخذ کرنا۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سوچ نہ ہی بنیادی طور پر عقل مند، نہ ہی فائدہ مند اور نہ ہی درست ہوتی ہے۔ بلکہ یہ اس شخص کی ذات پر منحصر ہے جو یہ فعل سرانجام دے رہا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ سوچ کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف دو باتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

(ا) احساس یا حس کی تعداد اور تنوع پر۔

(ب) (Self) نفس، یا خودی کی مہارت پر کہ وہ کس طرح اس کو پرکھتا ہے۔ اور پہلے تجربات سے مقابلہ کرتا ہے۔

آپ کسی عام آدمی کے ذہن کو جو کہ بغیر کسی تربیت اور سلسلہ کے سوچتا ہے کسی فلاسفر، سائنس دان وغیرہ سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر دونوں کی سوچ کا طریقہ کار ایک ہی ہے۔ تمام انسان ضرور سوچیں گے۔ انسانی فطرت ہی دراصل سوچ میں ہے۔

نقطہ یہ ہے کہ سوچنا ایک سادہ اور عام فعل ہے۔ اور یہ اتنا پیچیدہ نہیں جتنا کہ بعض کتب بتلاتی ہیں۔ اور یہ کوئی ایسا ذریعہ یا طریقہ نہیں جو صرف تعلیم کے ذریعہ ہی پیدا کیا جاتا ہے۔ بلکہ بہت سے سکول اور کالج اور یونیورسٹیاں تو سوچنے کے عمل کو روکنے کا باعث بنتی ہیں۔ اس قسم کے کالج اپنے طالب علموں کو مشاہدہ کرنے اور مقابلہ کرنے کے ذریعے سے کبھی سبق نہیں دیتے۔ توجہ کو مرکوز کرنے سے روکتے ہیں۔ یہ ہر ایک کی ذات کو اپنے حواس کو پرکھنے کی تعلیم نہیں دیتے۔ یہ دماغ کو مردہ گھر بنا دیتا ہے۔ اور یہ تعلیم یا جسے ہم تعلیم کہتے ہیں، کا سب سے تاریک پہلو ہے۔

جیسے کہ میں نے ثابت کیا ہے کہ نقل اتارنا سوچنے کی نسبت آسان عمل ہے۔ اس طرح غور و فکر کرنے استدلال کرنے، دلیل پیش کرنے کی نسبت خیالی پلاؤ پکانے تصور میں کھوئے رہنا زیادہ آسان ہے۔ اس لئے ہمارے سکول و یونیورسٹی بھی آسان راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ذہن کو بطور ورکشاپ استعمال کرنے نہیں دیتے تا کہ ذہن میں عمل اور فیصلے کی قوت آئے۔ مثال کے طور پر آپ ایک ہی ذہنی قوت کے دو لڑکوں میں سے ایک کو یونیورسٹی بھیج دیں اور دوسرے کو ورکشاپ میں۔ پچیس سال کی عمر میں دونوں کا مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ کس کا ذہن زیادہ عمل پذیر ہے اور جو مشاہدے کا ماہر بھی ہو۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سکول خواندہ آدمی زیادہ رکھ رکھاؤ والا اور اچھے تلفظ والا ہوگا۔ مگر دوسرا لڑکا زیادہ محنتی ہوگا۔ تعلیم عموماً تہذیب سکھلاتی ہے۔ سوچنا اور دماغ استعمال کرنا نہیں سکھلاتی۔ آپ دیکھ لیں کہ دراصل بڑے بڑے موجد جنہوں نے ہماری انڈسٹری بنائی وہ سکول کے بغیر ہی تھے۔ مثلاً ایڈیسن، راک فیلر، آرک رائٹ، کارنیگی وغیرہ۔ یہ تمام بچپن میں ہی کام پر لگ گئے تھے۔ ہمارے کالجوں کے پروفیسران کو ان پڑھ کہتے ہیں۔ مگر کیا کالج کے پروفیسر سوچنے کے معاملے میں خود ان پڑھ نہیں ہیں۔

سوچ دراصل تعلیم اور تہذیب کی مرہون منت نہیں ہوتی بلکہ یہ تخلیقی ہوتی ہے۔ یہ ذہن کی عملی قوت ہے۔ یہ صرف معلومات کو وصول کرنے کا آلہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی مجہول و سست یا بے حرکت۔ بلکہ یہ مشاہدہ کر سکتا ہے انفارمیشن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ حسّوں کو پرکھ سکتا ہے۔ دو اور دو جمع چار کرتا ہے۔ یہ حسوں کو خیالات اور اصولوں میں بدل دیتا ہے، یہ تنقید کرتا ہے اور تخلیق کرتا ہے۔ یہی خیالات موجد بناتے ہیں۔ ایجاد کرتے

ہیں۔ یہ نئی نئی ترتیب دیکر ایجادیں کرتے ہیں۔ ایجاد کرنا غیر معمولی ذہانت کے باعث نہیں ہوتا بلکہ یہ استقلال ومحنت کا ثمر ہے۔

سوچ کتابوں میں نہیں، چیزوں میں ملے گی۔ یہ حقیقت کالج والے بھول جاتے ہیں۔ کار، جہاز، پین اور پنسل کی ایجاد سب سوچ کا نتیجہ ہیں۔ تو اس سارے بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایک آدمی سوچ سکتا ہے۔ قدرت نے ہر ایک کو سوچنے کا آلہ دیا ہے۔ اس لئے سوچ پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوسکتی۔ تاریخ میں سینکڑوں بار ایسا ہو چکا ہے کہ حکمرانوں نے سوچ پر پابندی لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے ہمیشہ۔ بلکہ اس کے بدلے کسی سوچ والے نے ان کو اتار کو پھینک دیا۔

ہر ایک سوچتا ہے۔ آپ کے بیوی بچے، نوکر ملازم، غرضیکہ ہر ایک سوچتا ہے۔ سوچ ہی سب سے بڑا محرک ہے۔ یہی محرک حکومت کرتا ہے۔ یہی بادشاہوں پر بادشاہی کرتا ہے اور یہی شاہوں کا شاہ ہے۔ یہی نیچے گراتا ہے اور اوپر لاتا ہے۔ یہی قوت ہے اور یہی جا کر سچ، اچھائی اور نیکی بنتی ہے۔ اور انسانی نسل کی ترقی کا باعث بنتی ہے۔

ہر ایک عادات رکھتا ہے

قانون عادت دراصل قدرت اور انسانی فطرت کا قانون یا عادت مرکز یہ ہے۔ یہ تقلید اور نقل کی عادت کی طرح ہی ہے مگر اس میں فرق یہ ہے کہ اس میں زیادہ حد تک خود کاری ہوتی ہے اور لاشعوری طور پر یہ سرزد ہوتی ہے۔ یعنی عادت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم خود بار بار اپنی تقلید کرتے ہیں۔ ایک ہی چیز کو بار بار ایک ہی طرح سے کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ یہ چیز عادت بن جاتی ہے اور پھر شعوری طور پر سوچے بغیر ہی کی جاسکتی ہے۔

عادت اور تبدیلی دو مختلف خاصیتیں ہیں۔ عادت جمادیتی ہے جبکہ تبدیلی کو اگر عادت کے ساتھ توازن کے ساتھ قائم نہ رکھا جائے تو یہ دھماکہ کرتی ہے۔ یہ فطرت کا ایسا قانون ہے جس کے بغیر ہمیں اپنی ذاتی فطرت کی نشوونما نہیں کر سکتے۔

بعض فلاسفر عادت پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن اگر عادت نہ رہے تو پھر یہ سسٹم کیسے چل سکے گا۔ یہ تو ویسے ہی بات ہوئی کہ دیوار کی اینٹوں میں سے گارا نکال دیا جائے۔ عادت ہی اس میں مضبوطی لاتی ہے۔ اگر چہ بعض تبدیلی پسند لوگ عادت کے خلاف ہوتے ہیں مگر تبدیلی کے بعد پھر یہ خود عادت کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بلکہ یوں سمجھ لیں کہ اس کائنات میں عادت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سورج، چاند، ستارے ہر ایک اگر اپنے اپنے منہ سر والا ہوتا تو یہ نظام چل ہی نہ سکتا۔ یہ عادت ہی ہے جو اس نظام میں باقاعدگی لاتی ہے۔ دن رات بننے کا باعث بنتی ہے۔ موسم بناتی ہے۔ اس سے قومیں بنتی ہیں۔ اور شخصیت بناتی ہے۔ اور ہنر سکھلاتی ہے۔

عادت قدرت کا ایک ایسا کرشمہ ہے جو کہ محنت، سوچ، قوت فیصلہ، اور وقت بچاتی ہے۔ یعنی خود کاری کی وجہ سے یہ محنت بچاتی ہے۔ سوچ پر دماغ خرچ کرنے سے بچاتی ہے۔ قوت فیصلہ میں جو دقت اور محنت لگتی ہے اس سے بچالیتی ہے۔ عادت جسمانی بھی ہے اور ذہنی بھی۔ یہ اعصابی نظام میں شامل ہے۔ عمل سے Tissue بنتا ہے۔ اس سے Guitle اور اس سے ہڈی۔ یہ عادت کا جسمانی نتیجہ ہے۔

عادت سے کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی کام پہلی دفعہ ہی مشکل ترین لگتا ہے مگر دسویں دفعہ آسان ہو جاتا ہے اور سوویں دفعہ آسان تر اور خود کاری ہو جاتا ہے۔ یہ ہے عادت کا طریقہ اور اصول۔ اسی لئے پرانے طریقے ہمیشہ آسان اور سادہ لگتے ہیں۔ اور اس میں حفاظت محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے تبدیلی کی مخالفت کی جاتی ہے۔

اسی لئے کسی کی کسی عادت پر ناک بھوں چڑھانا فضول حرکت ہے۔ اگر ہم کوئلے کو کالا ہونے پر یا لوہے کو بھاری ہونے پر الزام نہیں دیتے تو دوسروں کو کیوں عادت رکھنے پر دیتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ بڑے سے بڑا انقلاب پسند بھی چند ایسی عادات رکھتا ہے جو کہ انتہائی احمقانہ ہوتی ہیں اور جس کا اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ اس بات میں ہم تمام ہی بے اصول اور بے عادت ہوتے ہیں۔ اسی لئے اپنے گناہوں کے کفارے کے طور پر ہم دوسروں کو الزام دیتے ہیں۔ یہ عادت دراصل دوسروں کو برداشت نہ کرنے کی عادت کی وجہ سے ہے۔ اس سے ہی گپ بازی، جھگڑے، جنگیں جنم لیتی ہیں۔ اور تمام غیر سماجی عمل جنم لیتے ہیں۔ اس سے قومیں اور بزنس تباہ ہو جاتا ہے۔

سفر کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس بری عادت سے چھٹکارا مل جاتا ہے یا کم از کم یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ دوسروں کو برداشت کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے۔ پہلی دفعہ ہر نئی چیز یا عادت دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ نفرت ہوتی ہے یا تکلیف ہوتی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ عقل آنی

شروع ہوجاتی ہے اوران کو برداشت کرنے لگ جاتے ہیں کیونکہ یہ سمجھ آجاتی ہے کہ عادات غلط یا صحیح نہیں ہوتیں بلکہ مقامی ہوتی ہیں۔اگر چہ وہاں کے لوگ اسے صحیح اور درست ہی کہیں گے۔اس لئے کہ اپنی بات کو کوئی بھی غلط ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اس طرح جس کو ہم ''سچائی'' کہتے ہیں وہ بھی ایک حد تک مقامی ہوتی ہے۔اور مقامی سوچ کی پیداوار۔بغیر سفر کے اور سوچ کے یہ جاننا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ سچائی دراصل عادت ہی کی ایک قسم ہوتی ہے۔اس لئے ہم عادت پر انحصار کر کے ترقی نہیں کر سکتے۔یہ موسم کی طرح ہوتی ہے۔اچھی، بری،اور غیر جانب دار، یہ فائدہ بھی پہنچاتی ہے اگر اچھی ہو۔اور اگر بری ہوتو بے انتہا نقصان بھی۔یہ ایسی اندھی قوت ہے جو کہ بے انتہا فائدہ بھی دے سکتی ہے۔بلندی پر لے جاتی ہے یا پھر نقصان پہنچا کر گرا دیتی ہے۔

عادت جسمانی اور ذہنی کے لحاظ سے بیماری ہے۔دماغ کا ایک حصہ صرف عادت کے ہی تحت کام کرتا ہے۔اسی طرح بیماری بھی دراصل جسمانی عادت میں گڑبڑ کا نام ہے۔یعنی سسٹم میں خرابی ہوگئی ہے۔جیسے پہلے کام کر رہا تھا۔اس سے مختلف ہوگیا ہے۔

انشورنس والے بتاتے ہیں کہ صرف 3 فیصد بوڑھے ہوکر مرتے ہیں۔8% حادثاتی اموات سے اور باقی 89 فیصد عادات کی وجہ سے جس کی وجہ سے جسم کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔آپ اپنی عادات کی وجہ سے ہی یا تو ترقی کر رہے ہوتے ہیں یا پھر تباہ ہو رہے ہوتے ہیں۔یہ سائنسی طور پر درست ہے۔یاد رکھیں کہ یہ اصول بالکل درست ہے۔اس لئے کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اپنی عادات کو چیلنج کرنا چاہیے۔اور اپنے محکمے کی عادات کو بھی۔تاکہ بعض خطرناک یا نقصان دہ باتیں عادت کی شکل اختیار نہ کریں۔اور نقصان نہ پہنچائیں۔

اہم سوال یہ ہے کہ آپ عادات پر حاوی ہیں یا عادات آپ پر کنٹرول کر رہی ہیں۔اگر آپ میں ایسی عادات ہیں جو کہ آپ پر بے قابو کئے ہوئے ہیں۔تو ان کو ایک ماہ کے لئے چھٹی دے دیں۔تاکہ آپ کو اپنے آپ پر کنٹرول حاصل ہوجائے۔اور آپ خود اپنے آقا بن سکیں۔بجائے عادات کے۔1902ء میں میں نے ایک ایسا ہی تجربہ کیا 3 ماہ تک میں نے گوشت، روٹی آلو، سبزی چائے، شراب چھوڑ دی۔اور صرف دودھ، کھجور ،اور فروٹ پر گزارہ کیا۔جس کے نتیجے میں میرا وزن 35 پونڈ بڑھ گیا۔اور صحت بہترین ہوگئی۔میرا خیال ہے کہ بہترین اور مکمل غذا ایک درجن کھجوریں۔اور اخروٹ اور بادام۔ایک ناشپاتی اور ایک سیر دودھ۔تین ماہ کے بعد میں نے یہ غذا کھانی چھوڑ دی اور اپنی نسل کی غذا پھر شروع کر دی اس لئے کہ آپ دوسروں سے ایک حد سے زیادہ مختلف نہیں ہو سکتے۔اور ہمیں تقلید اور عادت کے قانون پر عمل کرنا چاہیے۔اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سوچ اور تبدیلی کے قانون پر۔تب ہی آپ لوگوں کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

سب سے اچھا اور عقل مندانہ طریقہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کی عادات سے ملتا جلتا بہترین طریقہ اپنالیں اور اسے عادت بنالیں۔اگر آپ کے پاس فیکٹری یا مل ہے تو آپ اپنے ملازموں کے کام کرنے کی عادات کا مطالعہ کریں۔یاد رکھیں کہ ہر قسم کی غلط اور غیر اہم باتیں عادات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔آپ اپنے اگر کسی بھی فورمین سے پوچھیں کہ ہم یہ کیوں کرتے ہیں تو آپ کو جواب ملے گا کہ ہم ہمیشہ سے ایسے کرتے آئے ہیں۔یہ انتہائی احمقانہ جواب ہوگا۔ہر کام کسی وجہ سے کرنا چاہیے تب جا کر وہ کام ترقی پذیر ہوگا۔اور یہی سائنسی طریقہ ہے کام کرنے کا کہ ہر کام کی وجہ معلوم کی جائے۔اور پھر اس میں بہترین طریقہ نکالا جائے۔

فیکٹری میں لوگ مشین اور لوگوں کی عادات تین چیزیں ہوتی ہیں۔ہم لوگوں کی کام کی عادات پر بالکل غور نہیں کرتے۔یہی وہ حصہ ہے جس میں ترقی سے فیکٹری ترقی کر سکتی ہے۔زیادہ تر بزنس عادات اور رسوم کے تحت ہوتا ہے جو کہ نئے وقتوں میں کام نہیں دیتے۔اس لئے وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی عادات کو پرکھیں اور نئی عادات اختیار کریں۔

یادرکھیں۔عظیم لیڈراور رہنماوہی ہوسکتا ہے جو کہ ہمیں عادات بدلنے پر مجبور کردے یعنی ان عادات کو جو ہمیں نقصان پہنچارہی ہیں۔یہی عظیم رہنمائی کا طریقہ ہے کہ لوگوں کی نقصان دہ عادت کی تعریف نہ کی جائے بلکہ ان کو ان کی بری عادات کی بجائے نئی اور بہترین عادات کی طرف مائل کیا جائے۔عادات کو بنانے والا ہی اصل لیڈر ہوتا ہے۔

To be a habit maker - That is what leadership means.

نواں باب

ہر ایک بدلتا رہتا ہے

تبدیلی! حالات کا بدلنا! یہ قوت غیر مرکز یہ ہے۔ یہ عادت یا فطرت سوچ کی طرح ہے۔ صرف سوچ سے ایک لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کا مطلب ہوتا ہے عمل۔

انسانی فطرت کو بیان کرتے ہوئے تبدیلی کو میں نے اس لئے شامل کیا ہے کہ تبدیلی خواہش کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ یہ مجبوراً کرنی پڑتی ہے اور ہر ایک کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قدرت کی ہر چیز ایک جیسی نہیں رہتی۔ اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی میں وہ چیز تباہ نہیں ہوتی بلکہ ہیت بدل دیتی ہے۔ پانی بھاپ بنتا ہے۔ بھاپ پانی لیکن ہم یہ مشاہدہ کرتے بھول جاتے ہیں کہ یہ تبدیلی کا قانون اس کائناتی نظام کا حصہ ہونے کی بنا پر ہم پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ایک یونانی فلاسفر کا کہنا ہے کہ یہاں ہر چیز بدل رہی ہے۔ رابرٹ ڈنکن کا قول ہے کہ ''یہاں پر کوئی چیز ساکن نہیں ہے بلکہ متحرک ہے اور ہر وقت بدل رہی ہے''۔

اس دنیا میں کوئی بھی چیز ساکن نہیں، نہ ہی اس کی ہیئت مکمل حتیٰ کہ پتھر بھی وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں، صرف وہ تبدیل ہونے میں وقت زیادہ لیتے ہیں۔ اور اس دنیا میں وقت اتنا ضروری نہیں ہے کہ اس دنیا میں صدیاں گزر گئی ہیں اور اس طرح آپ کی فطرت کا ناقابل تبدیل ہونا بھی دھوکا ہے۔ جو شخص آپ پانچ سال پہلے تھے وہ اب نہیں ہیں۔ ہو بھی نہیں سکتے اس لئے کہ آپ کے جذبات، احساسات، تجربات بدلتے رہتے ہیں۔ بہاؤ قائم رہتا ہے۔ مگر بہنے والی چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔

ریڈیم کی دریافت کے بعد سے یہ نظریہ قائم ہوا ہے کہ دھاتیں تک بدل رہی ہیں۔ سونا تانبے میں بدل رہا ہے۔ چاندی سیسے میں، صرف Energy قائم رہنے والی ہے اور اس کی شکلیں اور حالت بدلتی رہتی ہے۔ ایک تبدیلی کے بعد دوسری تبدیلی آتی ہے۔ ایک حالت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، یہاں پر صرف ایک ہی چیز قائم رہنے والی ہے اور وہ ہے تبدیلی۔

آپ اپنے جسم کی حالت کو قائم سمجھتے ہوں گے حالانکہ آپ کے ہر عمل کے ساتھ اس میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے جو کہ کھانا کھانے سے دوبارہ بحال ہوتی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ آپ کا جسم ہر سات سال بعد بالکل نیا بن جاتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ اور پیدائش کا یہ عمل ہر جسم میں جاری وساری رہتا ہے۔ ہر درخت، ہر گھر، ہر فیکٹری، غرضیکہ ہر جگہ یہ عمل دونوں ساتھ ساتھ جاری رہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر حاوی نہیں۔ ایک دوسرے کے لئے جگہ خالی کرتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ سے ہی نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ اور نئی زندگی ہی بالآخر ٹوٹ پھوٹ میں منتج ہوتی ہے۔

قدرت کا یہ نظام ہی ایسا ہے جو کہ بظاہر ایک دوسرے کو مختلف نظر آتا ہے۔ جیسے کہ ایک گھومتا ہوا پہیا۔ اگر کوئی پہیئے کے اوپر بیٹھا ہو تو وہ اپنے آپ کو شمال سے جنوب کی طرف جاتا سمجھے گا جبکہ اسی پہیئے پر نیچے بیٹھا ہوا جنوب سے شمال کی طرف جاتا محسوس کرے گا۔ دونوں ہی درست ہونگے اپنے اپنے نقطہ نظر سے۔ مگر باہر سے دیکھنے والے کے مطابق دونوں غلط ہوں گے۔ بعینہ زندگی اور موت دونوں ہی ہم سب کو ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے۔ مگر یہ بھی پہیے کی طرح ہیں جو کہ ہر وقت جگہ بدلتا رہتا ہے۔ موت سے صرف نقل مکانی ہوتی ہے انسان نہیں مرتا۔

اگرچہ قدرت کے اس نظام میں ہماری کوئی حقیقت نہیں اس لئے کہ اس نظام میں کوئی بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ مگر ہر شخص اپنے آپ کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اسے اپنے آپ میں تنزل اور انحطاط کو روکنا چاہیے۔ ہم انسان، اس کائنات کے شعوری حصے ہیں اور ہمیں کوشش کرنی

چاہیے کہ اس کے غیر شعوری حصوں کے اثرات سے اپنے آپ کو بچائیں۔ ہم انحطاط اور تنزل کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اگر چہ ہم اتنے چھوٹے اور اتنے کمزور ہیں کہ ہم اس کائناتی اثر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکتے اور نہ ہی ہم اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر کے صبر و شکر کر سکتے ہیں یا پھر خود کو کائناتی طاقتوں کے حوالے کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس زندگی میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے ہی شعور ادا کیا گیا ہے اور ہمیں یہ حصہ ادا کرنا ہے، جب تک زندہ ہیں۔ اس لئے ہمارا حصہ زندگی کے ساتھ ہے موت کے ساتھ نہیں۔

ہم یا تو ترقی کرتے جاتے ہیں یا پھر زوال پذیر ہوتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں میں سے ایک نہ ایک چیز کرنی ہوتی ہے۔ ہم ایک جگہ پر ساکن نہیں رہ سکتے۔ اور یہی سبق بلکہ عملی سبق اس باب سے ہم حاصل کر سکتے ہیں۔

بار بار لوگوں نے زندگی کی حرکت کو منجمد کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ زندگی کے نظام کو منجمد کرنے کا مطلب موت سے دوستی ہے۔ اور اس طرح اس نظام کی موت ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح امیر لوگوں نے بھی اپنے فائدے کے لئے اپنے نظام کو منجمد کرنا چاہا اور بھول گئے کہ لوگوں کی فطرت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ وہ تبدیلی چاہتے ہیں۔ اور اس طرح فطرت تہذیب کے چمکدار حصوں کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایسے ہی پھینک دیتی ہے جیسے کہ کوئی کمہار ناکارہ برتن کو۔

ڈارون نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے کہ یہ زندگی تبدیلی سے عبارت ہے۔ یہاں کا قانون ہی یہی ہے کہ ہر چیز بتدریج ترقی کرتی ہے۔ اس زندگی کا اصول ہی یہ ہے "Survival of the Fittest" سب سے بہتر اور طاقتور ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اس اصول سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کائنات بالکل انصاف پسند ہے۔

انسانی فطرت کا ہر گوشہ ترقی کر سکتا ہے۔ یہ مفروضہ نہیں ہے یہ حقیقت ہے۔ ہمیں علم ہے کہ تمام پرندے، مچھلیاں، درخت سب ترقی کر کے اس حالت پر پہنچے ہیں۔ گندم ایک گھاس سے ترقی کر کے بنی ہے۔ کتا بھیڑئے سے بنا ہے۔ شیکسپیئر ایک چھوٹے سے بچے سے بنا ہے۔ غرضیکہ ہر طرف اس چیز کا ثبوت ہے کہ ہر چیز ترقی کر کے جو چاہے بن سکتی ہے۔

کوئلے کے ٹکڑے کو دیکھیں۔ اگر اسے دباؤ میں رکھیں تو ہیرا بن جاتا ہے۔ اگر اسے آگ دکھائیں تو یہ طاقت بن جاتا ہے۔ حالانکہ کوئلہ دراصل انرجی اور طاقت کی شکل میں آتی سورج کی کرنوں سے بنا ہے۔ اس لئے کسی کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کوئی چیز کیا بن جائے گی۔ اور یہی امید دراصل عمل رجائیت پسندی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم سے پہلے لوگوں نے کیا کر دکھایا ہے تو پھر ہم اداس نہیں ہوتے بلکہ پر امید ہو جاتے ہیں۔ اگر دوسرے ملک ترقی کر سکتے ہیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔

ہم اپنی ذاتی انا، خود پسندی سے اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں کہ جیسے ہم اب مکمل انسان بن گئے ہیں، حالانکہ سچ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم میں ہر وقت ترقی ممکن ہوتی ہے۔ اور ہم اپنے آپ میں ترقی کرنے کے امکانات کا صحیح جائزہ نہیں لیتے اور یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ ہم دراصل ان گھڑے ہیں۔ ہمیں خود کو ہر وقت اچھے سے اچھا بنانا پڑتا ہے۔ مکمل ہونے کا غلط خیال ہی دراصل انسانی فطرت کو ضائع کرتا ہے۔ اور اسی غلط خیال سے کہ ہم تبدیل نہیں ہو سکتے لوگ زیادہ تر اپنی زندگیوں کو خراب کر لیتے ہیں اور تبدیلی کی قوت کا کبھی احساس نہیں کرتے۔

دماغی اور ذہنی طور پر ہم صرف ابتداء ہی کرتے ہیں اور اسے انتہا سمجھ لیتے ہیں حالانکہ انتہا کا تو اندازہ ہی مشکل ہے۔ ڈاکٹر ماروین نے کہا تھا ''جب میں انسانی دماغ کو کاٹتا ہوں تو مجھے دماغ کے سوچنے والے حصے کے Tissue کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ دماغ کے سوچنے سے ہی اس حصے کی ترقی ہوتی ہے مگر یہ دماغ کا غریب ترین حصہ ہے''۔

ہم ہمیشہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ذہن ایک وائلن کی طرح ہے۔ یہ جیتا جاگتا ہے جس میں خیالات، سوچ اور جذبات کی لا انتہا ممکنات موجود ہیں۔ ہم اپنے بہتر کو بہترین میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی ہر حالت کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں۔

آپ کی پوری طاقت اور انرجی کیا ہے؟ آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں؟ کون کسی ایسے آدمی کی ترقی پر حد مقرر کر سکتا ہے جس نے ایک دفعہ عہد کر لیا ہو کہ وہ اپنے رویئے اور دوسروں کے ساتھ مقابلے میں کبھی ہمت نہ ہارے گا اور کسی بھی مشکل کو خاطر میں نہ لائے گا؟ اس آدمی کی طاقت لامحدود ہوتی ہے آپ بھی یہی لامحدود طاقت رکھتے ہیں اور ایک دفعہ عہد کر لیں اور ساری دنیا کا مقابلہ شروع کر لیں تو اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوگی۔ آپ صرف ارادہ اور عہد کر کے تو دیکھیں۔

دسواں باب

ہر ایک کو تعریف اور سرزنش کی ضرورت پڑتی ہے

تعریف ہر ذی روح کی ضرورت ہے۔اس کے بغیر کوئی بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ جہاں پر تعریف مفقود ہوتی ہے وہاں پر افسردہ دلی ، بے شرمی، سستی، گھٹن، اور جرم جنم لیتے ہیں۔ وہاں پر جمود اور بے حرکتی طاری رہتی ہے۔ ہر انسان کے دل میں تعریف سننے کی بے پناہ، خواہش ہوتی ہے اور ملامت اور عیب جوئی کا ڈر۔ یہ فطرت تمام ممالک اور تمام انسانوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔اور اس کی طاقت کا احساس ہم انسانوں کو کم ہی ہے۔

ہم تعریف کیوں سننا پسند کرتے ہیں؟ غالبًا اس لئے کہ اس میں ہم آسانی اور حفاظت محسوس کرتے ہیں۔ہم فطرتاً یہ سن کر محفوظ محسوس کرتے ہیں کہ اگر لوگ ہمیں پسند کرتے ہیں ہمیں اچھا کہتے ہیں تو یقیناً ہم ان لوگوں کے نقصان پہنچانے سے محفوظ رہیں گے۔تو انسانی فطرت کے پہلے اصول ''اپنی حفاظت انسانی فطرت کا اول اصول ہے''۔ کے مطابق تعریف دراصل حفاظت کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔

آج تک کوئی بھی انسانی تہذیب وتمدن یا سوسائٹی ایسی نہیں بنی جس میں درجات نہ ہوں یا عزت کے مقام نہ ہوں حتیٰ کہ وحشی حبشی بھی اپنا حساب رکھتے ہیں، ان میں بھی جزا اور سزا موجود ہے۔ایمرسن کے مطابق بارہ اصولوں میں سے پہلا اصول 'جزا' ہے۔اسی لئے ہر معاشرہ میں ڈگریاں، دستار فضیلت، خودنوشت سوانح عمریاں، وغیرہ وغیرہ لوگوں کی یا اپنی ذات کی تعریف میں قائم کی گئی ہیں۔

انسانی فطرت کے اس جزو کی طرف سب سے پہلے Phrenologists یا علم کاسۂ سر کے متعلق تحقیق کرنے والوں نے محسوس کیا کہ سر میں ایک اظہار پسندیدگی اور اپنی جنس کے لئے ہمدردی ومحبت کے جذبات کا حصہ تھا مگر وہ بھی ذاتی تعریف وسرزنش کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے۔اظہار پسندیدگی دراصل عادت کی طرح طاقتور سماجی قوت ہے۔اس سے قبیلے اور پرندے تک ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔

شوق و جذبے (Ambition) کے اندر دراصل یہی محرک ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے ہی لوگ زیادہ دوست بنانا اور کامیابی چاہتے ہیں کیونکہ غربت ایک ایسی لعنت ہے جس میں اپنے بھی چھوڑ جاتے ہیں۔

کوئی آدمی بھی اپنے متعلق، دوسروں کی رائے کو نظر انداز نہیں کرسکتا کیونکہ ہم سب لوگوں کے اظہار پسندیدگی کے محتاج ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی روتی ہوئی آئی اور اپنی ماں سے کہنے لگی ''امی! میں اب یہودی نہیں رہنا چاہتی اس لئے کہ بچوں میں سے کوئی بھی یہودیوں کو پسند نہیں کرتا'' اس سے اظہار پسندیدگی کی قوت کا اندازہ لگالیں۔ ہر وقت سرزنش کرنے سے اور تعریف نہ کرنے سے غلامانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے یا پھر مجرم ذہنیت۔اس طرح صرف تعریف اور بغیر سرزنش کے بیوقوف اور ظالم وجابر اور استحصال پسند پیدا ہوتے ہیں۔

تعریف کو حد سے زیادہ کیا جائے تو خوشامد بن جاتی ہے۔اور خوشامد ایسی طاقت ور ہے کہ بادشاہوں پر بھی حکومت کرتی ہے۔صرف تعریف سے ہی تاریخ میں تمام ظالم وجابر حکمران بنے جو کسی کو بھی بولنے یا اپنی رائے دینے کا حق نہ دینا چاہتے تھے۔

خوشامد سے بہت ہی خوش قسمت بچ سکتا ہے۔ یہ افیون کی طرح نقصان دہ، اور نشہ آور ہے۔اور یہ ہر کان کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک زہریلی گیس خوشبو سے ملی ہوئی ہو۔ مارکولس آرلیٹس جو کہ روم کا بادشاہ تھا اور بہت ہی عقل مند آدمی تھا نے کہا تھا ''کہ زندگی کی تمام عزتیں دراصل بے فائدہ ہی ہوتی ہیں۔'' اس قول کے باوجود وہ اپنی تمام شان وشوکت سے آخر تک چمٹا رہا۔

تعریف اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ کھانا۔لیکن اس کے ساتھ ہی جب ضروری ہوتو سرزنش کی ملاوٹ سے اعتدال قائم رکھنا ضروری ہے۔ تعریف سورج کی روشنی کی طرح ہے۔اس سے ہمیں نشوونما ملتی ہے لیکن جب یہ ضرورت سے زیادہ ہوتو پھر یہ ہمیں خراب بھی کر دیتی ہے۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جتنا آدمی بڑا ہوگا وہ تعریف کا اتنا ہی بھوکا ہوتا جائے گا۔چھوٹے آدمیوں کو تعریف کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اس لئے کہ وہ زندگی کی ضروریات کی تگ ودو میں لگے ہوتے ہیں اور ان کی تعریف انکے مقصد کا حاصل ہونا ہی ہو جاتا ہے اور اس سے ان کو طمانیت مل جاتی ہے۔جبکہ بڑے آدمی صرف بڑی چیزوں کا سوچتے ہیں اور بڑے کام کر کے دکھانے پر بڑا کہلوانا پسند کرتے ہیں۔میں نے بطور صحافی یہ سیکھا ہے کہ بڑے آدمیوں کے ساتھ بات چیت میں تعریف سے شروع کریں۔ان کو انٹرویو کرنے سے پہلے میں ہمیشہ ان کی زندگی کا مطالعہ کرتا تھا اور اپنا تعارف ہمیشہ ان کی کسی تحریر یا تقریر کے حوالے سے شروع کرتا تھا یا پھر ان کے کسی کارنامے کی تعریف سے۔میں نے ان بڑے لوگوں کی بات کی کیونکہ ان بڑے آدمیوں سے کام نکلوانے کا یہی طریقہ ہے۔اس اصول سے کوئی مستثنیٰ نہ ہوگا کیونکہ جب آدمی ترقی کر لیتا ہے تو پھر اپنی تعریف سننا بھی پسند کرنے لگتا ہے۔بلکہ وہ اپنے آپ کے بارے میں ہی سننا چاہتا ہے۔

بڑے آدمی دراصل جانتے ہیں کہ ان کی بڑائی میں دراصل لوگوں کی رائے کا ہی بڑا حصہ ہوتا ہے۔وہ اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ لوگوں کی رائے میں بڑی قوت ہوتی ہے۔وہ بنا سکتی ہے اور بگاڑ سکتی ہے اور تباہ کر سکتی ہے۔اس لئے وہ بڑائی کے خالق یعنی لوگوں کی تعریف سے واقف ہوتے ہیں۔اسی لئے وہ تعریف سننے کا شکار بن جاتے ہیں۔

تعریف اور الزام: دونوں ہی ہماری سوسائٹی کا حصہ ہیں۔جب کوئی بادشاہ یا صدر کسی ہیرو کے سینے پر تمغہ لگاتا ہے اور لوگ تالیاں بجاتے ہیں تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔جبکہ ایک مجرم کو جب جج آخری سوال پوچھتا ہے کہ تم مجرم ہو یا نہیں۔تو وہ آدمی اور اس کے عزیزوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔

تعریف اور الزام۔دونوں ہی مذہب کا بڑا حصہ نہیں ہیں بلکہ مذہبی لٹریچر کا بڑا حصہ خالق حقیقی کی تعریف پر ہی مشتمل ہے جس نے ہمیں ہر ایک چیز دی ہے۔اسی طرح محبت کرنے میں تعریف ہی تعریف کی جاتی ہے۔ایسے لگتا ہے کہ ہم نے محبت کے اظہار کے الفاظ صرف مولویوں، شاعروں اور محبت کرنے والوں کے حوالے کر دیئے ہیں۔شاید اسی بحث سے یہ ظاہر ہو سکے کہ ہم ٹریڈ اور انڈسٹری میں تعریف کیوں استعمال نہیں کرتے۔محبت اور عبادت میں ہم تعریف کرتے کرتے بیوقوف تک لگنے لگتے ہیں۔اور عام زندگی میں الزام تراشی میں انتہا کر دیتے ہیں۔کیا میں یہ درست بات نہیں کہہ رہا؟

کیا ہم اپنے گھر اور فیکٹری کو سزا اور خوف سے نہیں چلاتے بہ نسبت جزا اور معاوضے کے۔فیکٹری کا ریکارڈ دیکھ لیں۔اس میں سوائے شکائیتوں۔دھمکیوں اور نکالے جانے کے نوٹس کے علاوہ کیا ہوتا ہے۔اور کیا یہ بہت ہی بڑی غلطی نہیں ہے۔؟

کیا ہم نے اپنے کارکنوں کا جذبہ غصے اور الزام تراشی سے برباد نہیں کر دیا۔کیا ہم یہ حقیقت نہیں بھول گئے کہ غلام کارکن ہی قوموں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔کیا ہم نے فیکٹری اور گھروں سے تعریف کا عنصر بالکل ہی خارج نہیں کر دیا۔

یہ حقیقت بھی سامنے رکھیں کہ آدمی پیسے کے لئے کام کرتا ہے مگر تعریف کے لئے وہ جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ہماری آنکھیں اس حقیقت کو جان کر حیرت زدہ رہ جائیں گی کہ زندگی کے نیک ترین مقاصد دلوں میں کتنی وقعت رکھتے ہیں ۔جنگ کے شروع ہوتے ہی یہی فیکٹریوں کے مزدور بڑے بڑے ہیرو پیدا کرنے لگتے ہیں جب انہیں موقع فراہم کیا جاتا ہے۔جنگ سے ہی ہمیں تمغوں کی اہمیت کا اندازہ ہو جانا

چاہیے۔اسی طرح گھر میں بھی اور فیکٹری میں بھی تمغے اور عزت کا مقام پرانے کاریگروں کے لئے ہونا چاہیے اور گھروں میں بزرگوں کے لئے عزت کا مقام۔

جب لارڈ کچنر نے ایک وکٹوریہ کراس کے ہیرو کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ ''مجھے تم پر فخر ہے'' تو وہ دراصل تمام مینجروں کو ایک ایسا طریقہ پڑھا گیا ہے جس سے اچھا کام لیا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ اصول یاد رکھنا چاہے کہ کسی بھی جگہ کا انتظام کرنے میں ہر فرد اور آدمی کا حق ہے کہ اس کی عزت کی جائے اور اس کی جائز تعریف کی جائے اور جب ضرورت پڑے تو سرزنش کی جائے۔اس قسم کا انصاف ہر آدمی چاہتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہمیں تعریف اور سرزنش یا الزام کو پکا کرنا چاہیے۔یعنی تعریف اور جھڑک دونوں خاص مقصد کے لئے ہوں۔اس لئے کہ ہر آدمی میں اچھائیاں اور برائیاں ہوتی ہے۔اگر آپ کسی کی تعریف کریں تو خاص عادت یا خاص کام کے لئے۔اگر آپ اسے جھڑکیں تو کسی خاص غلطی یا عادت کی وجہ سے۔یہ نہ ہو کہ آپ ایک غلطی کی بجائے پورے کے پورے آدمی کو ہی برا کہہ دیں۔یاد رکھیں ہر آدمی سخت سے سخت الفاظ بھی سن لے گا اگر کسی خاص غلطی پر اسے ٹوکا جائے۔لیکن ساتھ ہی اس کی جائز اور حقیقت پسندانہ تعریف بھی کی جائے تو وہ سخت سے سخت الفاظ بھی برداشت کرے گا۔یاد رکھیں کہ دونوں ہی انسان کی تربیت اور ترقی کے لئے ضروری ہیں۔تعریف اور سرزنش۔

ہر ایک رہنما کی عزت کرتا ہے

اس کائنات میں خالق کائنات نے ترتیب رکھی ہے اور یہ ہر بات میں ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کسی بھی چیز پر نظر ڈالیں گے تو باقاعدگی اور ترتیب ہوگی، چاہے ستارے ہوں، پھول ہوں یا درخت۔ اس اصول کو ہم دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ فطرت ہر چیز کو ترتیب دیتی ہے۔ فطرت ہی رہنما مقرر کرتی ہے۔ فطرت ہی رستہ دکھلاتی ہے۔

تمام جاندار، جانور، پرندے اور انسان اپنے لئے رہنما مقرر کر لیتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں حتیٰ کہ وحشی سے وحشی انسان بھی اپنوں میں سردار مقرر کرتے ہیں۔ جمہوریت جس میں ہر ایک برابر ہوتا ہے یا کم از کم سمجھا جاتا ہے، نہ کبھی رہی ہے نہ ہی کبھی آسکتی ہے۔ یہ دنیا میں سب سے بڑا دھوکا ہے جسے جمہوریت کہتے ہیں۔

ایک جم غفیر یا گروہ بھی اپنے میں سے لیڈر مقرر کر لیتا ہے۔ انفرادیت پسندی زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ کسی نہ کسی کو بڑا بننا ہی پڑتا ہے۔ اس کی مثال بوسٹن امریکہ کی ہے جس میں چالیس پچاس اشخاص نے تنظیم کے خلاف اور انفرادیت پسندی کے لئے مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلی بات جو انہوں نے کی وہ اپنا لیڈر مقرر کرنا تھا۔ دوسری بات قواعد مقرر کرنا تھی۔ چند بار کے ملنے کے بعد ان پر اس بات کے احساس کا ظہور ہوا کہ انہوں نے اپنی تنظیم بنالی ہے جس پر اس پر انہوں نے وہ تنظیم توڑ ڈالی۔

جب بھی دو آدمی مل کر کام کریں گے تو ان میں سے ایک لیڈر بن جاتا ہے۔ رہنمائی سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ یا وہ رہنمائی کرے گا یا دوسروں کو رہنما ماننے پر مجبور ہو جائے گا کیونکہ جب بھی آدمی اکھٹے ہونگے تو ان میں سے جو بھی زیادہ ماہر، بہادر یا خوش تدبیر ہوگا اس کے گرد دوسرے جمع ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اسی اصول پر تنظیم قائم ہوتی ہے۔

لیڈرشپ کے قانون کی بہترین مثال شہد کی مکھی ہے۔ ایک چھتے میں 90 ہزار تک مکھیاں ہوتی ہیں اور وہ تمام ایک ملکہ کے گرد گھومتی ہیں۔ ملکہ دنیاوی معنوں میں لیڈر تو نہیں بلکہ صرف وہ ایک ماں ہوتی ہے اور ایک موسم میں قریباً 40 ہزار بچے دیتی ہے لیکن مرکز وہی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر شہد کے چھتے کا گھر ممکن ہی نہیں ہے۔

شہد کی مکھیاں سب سے زیادہ تنظیم کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی دیتی ہیں، اور وہ مقصد ہے بچوں کی نگہداشت۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ انسانوں سے پوری جنگ کرتی ہیں۔ آدمی کا ذہن اس کے اپنے وزن کا 1/40 حصہ ہوتا ہے۔ اور شہد کی مکھی کا اپنے وزن کا 1/174 حصہ۔ مگر وہ اپنے ذہن کا پورا حصہ استعمال کرتی ہے۔ جب کہ آدمی نہیں کرتا۔

شہد کی مکھی تنظیم کرنے میں ماہر ہے۔ ہر چھتے میں ہر کام کرنے کے لئے مکھیاں ہوتی ہیں۔ یعنی ہر چھتے میں کاریگر، نرس، موم بنانے والی اور شہد اکھٹے کرنے والی مکھیاں ہوتی ہیں۔ اس تمام مرحلے میں ترتیب یوں ہوتی ہے، ملکہ کے بچوں کی پیدائش۔ مرد مکھیوں کا قتل عام، مکھیوں کی فوج، شہد کا اکھٹا کرنا، سردیوں کی نیند، شہد کے چھتے سے بڑھ کر کوئی بھی بہتر بنا ہوا سلسلہ نہیں ملے گا اور یہ سلسلہ صرف تنظیم کا ہی مرہون منت ہے۔

شہد کی مکھیوں سے کم تر درجہ پر انسان ہیں۔ انگلینڈ میں لوگوں نے اپنے بادشاہ، رچرڈ اول کو چھڑانے کے لئے بڑے پیسے بطور تاوان ادا

کئے تھے جب اس کو آسٹریلیا والوں نے اغوا کر لیا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ لوگ بادشاہ کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے حالانکہ رچرڈ انتہائی احمق انسان تھا۔ انگلینڈ والوں نے اپنے بادشاہ پہلے سکاٹ لینڈ، پھر جرمنی، ہالینڈ سے امپورٹ کئے کیونکہ وہ بادشاہ کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ انگلینڈ میں لیڈرشپ کے متعلق اچھی سمجھ موجود ہے۔ اور یہیں پر لوگ اقتدار سے دوسری قوموں کی نسبت کم خراب ہوتے ہیں۔ انگلینڈ کے لوگ زیادہ ذمہ داری اٹھانے کے بھی شوقین ہیں۔ یہی لوگ سب سے پہلے آزاد قوموں کا اتحاد کرنے میں کامیاب ہوئے اور برٹش کی حکومت دراصل سب سے بہتر سٹینڈرڈ کی لیڈرشپ کے لحاظ سے مثال ہے۔ میں خود کینیڈا کا رہنے والا ہوں مگر یہ الفاظ ایک بوئر جرنیل کے ہیں۔

انگلینڈ میں بھی لیڈرشپ کے معاملات کو محسوس کیا جاتا ہے، سمجھا وہاں بھی نہیں جاتا۔ اگرچہ وہاں ذاتی طور پر چند اچھے لیڈر ہیں مگر برٹش، بحیثیت قوم، اپنی لیڈرشپ کو زیادہ معاف کرنے والے اور برداشت کرنے والے ہیں۔ پارلیمنٹ کے طریقے سے ہم اپنے لیڈر منتخب کرتے ہیں مگر انتہائی ناقص لیڈر چنتے ہیں۔ اس طریقے سے ایک قابل آدمی کو چننا آسان نہیں ہے اور ایک ناکارہ آدمی آجائے تو اسے نکالنا انتہائی مشکل ہے۔ ہر قسم کے لوگ منتخب ہو جاتے ہیں اور پھر ساری عمر لوگوں پر حاوی رہتے ہیں۔ اب تک جمہوریت میں ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا جس سے لیڈر کی قیمت اس کے حاصل کردہ نتائج سے نکالی جائے۔ اور یہی جمہوریت کی سب سے بڑی خامی ہے۔

وراثت کا جہاں رواج ہے۔ وہاں بھی یہی خامی ہے کہ قابل باپ کا بیٹا نالائق ہوتا ہے۔ اور نالائق باپ کا لائق بیٹا۔ ہر خاندان کی یہی روایت ہے۔ اس لئے ہم رہنمائی کے لئے خاندانی وراثت کے قانون پر اعتماد نہیں کر سکتے اور نہ ہی موجودہ جمہوریت کے چناؤ کے نظام سے ہی فائدہ کی توقع ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت میں ووٹ اکھٹے کرنے کی قابلیت رکھنے والے آدمی کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس میں رہنمائی کی بھی صلاحیت ہو۔ ایسے لیڈروں میں عام طور پر رہنمائی کی جراءت نہیں ہوتی اس لئے کہ صرف نعروں سے ہی لوگ وفادار نہیں بن سکتے۔ لیڈر کو کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا پڑتا ہے۔

جمہوریت دراصل فرانسیسی انقلاب کا ثمرہ ہے۔ جس نے ہمیں یہ نعرہ دیا۔ ''آزادی، مساوات اور بھائی چارہ'' حالانکہ انقلاب فرانس سے اب تک یہ تینوں چیزیں حاصل نہیں ہوئیں اور نہ ہی ہوں گی جب تک کہ لیڈر کو منتخب کرنے کا طریقہ ایجاد نہیں ہو جاتا۔ انقلاب فرانس اور انقلاب امریکہ دونوں اس میں ناکام رہے ہیں۔

یاد رکھیں کہ آدمی ایک آدمی کے وفادار ہونا چاہتے ہیں کسی بورڈ آف ڈائریکٹر کے نہیں۔ اس لئے لیڈرشپ کا سلسلہ ہمیشہ رہے گا۔ لوگ ایک لیڈر کے وفادار ہوں گے۔ اور لیڈر ضرور چنیں گے۔ اسی وجہ سے جہاں بھی حکومتی ادارے ہوں گے وہاں اس ذاتی لیڈر کی یا رہنما کے فقدان کی وجہ سے کام نہیں چل سکے گا۔ لوگ کیسے ایک عارضی وزیر اور پکے سیکرٹری کے بیک وقت وفادار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے سول سروس ناکام رہی ہے۔

جب تک دنیا قائم ہے۔ ہر آدمی اپنے سے بہتر کی رہنمائی کو تسلیم کرے گا اور اپنے سے کم تر کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ یہی لیڈرشپ کا اصول ہے۔ اور دنیا اسی اصول کے مطابق چلتی رہے گی۔

بارہواں باب

ہر ایک میں جنسیت ہے

یہ چونکہ بزنس کی کتاب ہے جو کہ بزنس مین کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے مجھے جنسیت کے موضوع پر لکھنا نہیں چاہیے تھا مگر چونکہ یہ زندگی کا ضروری اور اہم حصہ ہے اس لئے اس پر لکھنا ضروری ہے۔ اس باب میں رائے کی بجائے حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔

یہ بات اس موضوع کے بارے میں ہے جس کے بارے میں ہم سب مختلف رائیں رکھتے ہیں مگر اصل علم نہیں رکھتے۔ دراصل اس موضوع پر کوئی بھی آدمی یا عورت صحیح جذبات کا اظہار نہ کرتی ہے نہ کرے گی۔ اس لئے اصل علم حاصل ہونا بہت مشکل ہے اور نہ ہی سائنسی طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جب بھی اس موضوع کو چھیڑا جائے گا تو ہم جذبات کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں اور قوت استدلال سے کام لینا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں نے صرف دو ہی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک ''آدمی اور عورت'' پیولاک ایلس کی لکھی ہوئی اور دوسری ''جنس کی پیدائش'' گڈس اور تھامیسن۔ دونوں کتابیں ہی تجارت اور ٹریڈ پر جنس کے اثرات کے موضوع سے بحث نہیں کرتیں۔

آج تک اس موضوع کو سائنسی طریقے سے پڑھا نہیں گیا، نہ ہی اس پر سائنسی طریقہ سے تحقیق ہوئی ہے۔ جس نے بھی تحقیق کی ہے وہ بھی اس موضوع پر شدت پسند ہی ثابت ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر فراڈ تو اس حد تک پہنچ گیا کہ اس کا کہنا ہے کہ ہر ذہنی بیماری جنس کے اثر کے تحت ہی ہوتی ہے۔ ایک حقیقت بہر صورت سامنے ضرور آتی ہے کہ آدمی آدمی ہے اور عورت عورت دونوں میں کافی فرق ہے۔

دونوں کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے کافی اختلاف رکھا ہے اور دونوں کی فطرت ہی سے مل کر انسانیت جنم لیتی ہے۔ یہ دونوں ذہنی اور جسمانی طور پر مختلف ہیں۔ ان میں سے کون برتر ہے اور کون کم تر، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے اس لئے کہ دونوں ہی اپنی اپنی جنس کی طرف داری کریں گے۔

ہم جنس کے بارے میں اب تک صرف ''کیسے'' کا جواب دے سکتے ہیں ''کیوں'' کا جواب دینا مشکل ہے۔ ہمیں صرف اتنا پتہ ہے کہ زندگی ایک Cell یا خلیے سے بنتی ہے۔ خلیے تقسیم ہو ہو کر تعداد میں بڑھتے رہتے ہیں۔ چند چھوٹے ہوتے ہیں اور چند خلیے بڑے۔ چھوٹے خلیے نر ہوتے ہیں۔ اور بڑے خلیے مادہ۔

اس بنیادی خلیے سے ہی فرق ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ چھوٹے یا نر خلیے زیادہ متحرک، زیادہ طاقت والے ہوتے ہیں۔ جبکہ مادہ خلئے سائز یا جسامت میں بڑے ہوتے ہیں مگر سست ہوتے ہیں۔ اسی طرح چھوٹے خلئے زیادہ جوش والے اور کم برداشت والے یا کم قائم رہنے والے ہوتے ہیں۔ جبکہ مادہ خلیے کم جوش والے اور زیادہ قائم رہنے والے ہوتے ہیں۔ ان بنیادی خلیوں کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نر ہمیشہ کیوں زیادہ پر جوش۔ باعمل، تغیر پسند اور جدت پسند ہوتا ہے جبکہ مادہ کم جوش والی۔ ہمدرد، وفادار، صابر، ہوش و حواس قائم رکھنے والی ہوتی ہے۔

آدمی جانوروں کی طرح ہے جو کہ انرجی کو استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ عورتیں پودوں کی طرح ہیں جو کہ انرجی کو ذخیرہ کرتی ہیں۔ آدمی غیر مرکزیہ ہیں جبکہ عورت مرکزیہ ہے۔ آدمی اپنی ذات کے گرد گھومتا ہے جبکہ عورت نسل کی بقا کی حامی ہے۔ آدمی اور عورت کی جسمانی ساخت کا تجزیہ کریں تو زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ صرف عورت میں سونگھنے کی حس زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اور مرد کے خون میں سرخ ذرے زیادہ ہوتے ہیں جس

کی وجہ سے اس میں بہ نسبت عورت کے HB زیادہ ہوتی ہے۔ مردوں میں عورتوں کی نسبت چار گنا زیادہ خودکشی کا رجحان ہے، پانچ گنا زیادہ جرائم، اور ہزاروں گنا زیادہ سیلانی طبیعت۔ عام طور پر عورت ہی مردوں پر اثر انداز ہوتی ہے جبکہ مرد عورتوں کو نہیں بدل سکتے۔ بہت کم عورتیں مقابلے دیکھنے جاتی ہیں جبکہ ہر مرد اس کا شوقین ہوتا ہے۔ ہر ملک اور ہر جگہ مرد ہی عورت کے پیچھے بھنورے کی طرح پھرتا ہے۔ اور ہر جگہ یہی ڈھونڈنے والا ہوتا ہے۔ اور عورت ڈھونڈی جاتی ہے۔

انسانی ارتقا میں ہمیشہ مرد ہی نئی چیزیں اختراع کرتا ہے۔ مگر یہ عورت ہوتی ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ کون سی نئی چیز اپنانی ہے اور کون سی اچھی ہے۔ ڈارون کا کہنا ہے ''کہ جنسی انتخاب ہمیشہ مرد کی ہمت، مقابلہ پر ہوتا ہے مگر عورت کے مزاج، مذاق اور سمجھ کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے''۔ عورت ہی اپنے بچے کو پسند کرتی ہے کیونکہ مرد کو پسند کرنا اسی کا کام ہے۔

آدمی خلیے کے دنوں سے ہی بے چین ہوتا ہے اور عورت ساکن و خاموش۔ اسی لئے قدرت اس انسانی نسل کی بقا کے لئے عورت کو ہی مرکز بناتا ہے۔ اور مرد کو اس مرکز کو قائم رکھنے کا ذریعہ۔

آدمی اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے ہی تجارت، ریل، جہاز، بنانے میں کامیاب ہوا جبکہ عورت اپنی غیر متحرک زندگی کی بنا پر گھر میں بس گئی۔ اور اس نے ہی سماجی رسوم، گھریلو نفاست وغیرہ کی طرف توجہ دی اور گھر کو مرکز اور سکون کی جگہ بنا دیا۔

مرد کی علامات ہیں، قانون، جنگ، کھیلیں انجینئرنگ، سیاست فیکٹریاں، سائنس ہوا بازی وغیرہ۔ جبکہ عورت کی علامات ہیں، گھر، نفاست، بچے، سوسائٹی، نرسنگ، خانہ داری، لباس سازی، خرید و فروخت، وغیرہ۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں جنسیت کا عنصر نہیں نظر آتا ان میں شاعری، ڈرامہ، آرٹ، گانے افسانے تعلیم و تربیت اور صحت ہے۔

آدمی زیادہ تر قومی سطح پر سوچتا ہے جبکہ عورت مقامی سطح پر۔ آدمی اصولوں کی باتیں کرتا ہے جبکہ عورت تفصیل کی۔ آدمی زیادہ تر خیالی اشیاء کا سوچتا ہے جبکہ عورت اصلی و حقیقت کی اشیاء کی۔ آدمی تجربات کا شوق رکھتا ہے جبکہ عورت کو تحفظ کی فکر ہوتی ہے۔ آدمی ہی نے تنظیم قائم کی ہے نظم و ضبط کے اصول وضع کئے ہیں۔ غرضیکہ بڑی بڑی تنظیمیں مرد کی پیدا کردہ ہیں۔ بہت کم عورتیں اس طرف توجہ دیتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ عورتیں عام فہم اور سادہ چیزوں کی طرف توجہ دیتی ہیں جبکہ مرد مشکل اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی طرف۔ عورت عام طور پر ذاتی اشیاء کو اہمیت دیتی ہے جبکہ آدمی بڑی اور تنظیم شدہ چیزوں کو مثلاً عورت گندم کو پتھر سے پیس لینے پر قناعت کرے گی، جبکہ آدمی ایسی چکی کی سوچے گا جس میں ہر گھنٹوں ہزار من گندم پس جائے۔ عورت چرخے پر صبر کرے گی جبکہ آدمی ہزاروں تکلے والی فیکٹری لگانے کا سوچے گا۔

آدمی زندگی کو ایک کھیل تماشے کی طرح سمجھتا ہے اس لئے کہ وہ زندگی کو جنم دیتے وقت بھی کھیل سمجھتا اور مزہ ہی لیتا ہے جبکہ عورت کے لئے زندگی کو جنم دینا تکلیف دہ مرحلہ اور عمل ہے۔

میں نے اب تک جو لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ مرد اور عورت دو مختلف فطرتیں رکھتے ہیں۔ اور اسی لئے تجارت کے لئے یہ علم انتہائی ضروری ہے۔ جب بھی ہم چیزیں بیچیں یا خریدیں، اشتہار دیں، یا کارکن ملازم رکھیں یا نئی چیزوں کو ڈیزائن کریں تو یہ اختلاف فطرت ذہن میں رہنا چاہیے۔ آج کل کام کے سلسلے میں بھی گڑبڑ ہے۔ جو کام مردوں کو کرنے چاہیں وہ عورتیں کر رہی ہیں اور جو عورتوں کو کرنے چاہیں وہ مرد کر رہے ہیں۔ امریکہ میں 303 کاموں کی لسٹ میں سے 294 کاموں میں عورت شامل ہوگئی ہے۔ بلکہ اب تو وہ انجینئر اور قانون دان بننے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں 20 لاکھ عورتیں دکانوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور ہوگئیں جس کا خوش گوار اثر ہوا۔ اور فیکٹریوں کی کام کی فضا میں بڑی تبدیلی آئی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی فیکٹریوں کے جھگڑوں سے نجات مل جائے گی۔

آج بھی چیزوں کو ڈیزائن مرد ہی بناتے ہیں مگر عورتیں ہی یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ کون کامیاب ہوگا اور کون سا ناکام ہوگا کیونکہ خریداری دراصل عورتیں ہی کرتی ہیں۔ اپنے لئے، اپنے بچوں کے لئے اور اپنے آدمیوں کے لئے۔ یہ قریباً 4/5 حصہ خریدتی ہیں جبکہ مرد صرف 1/5 حصہ۔ یہی تجارت پر کنٹرول کرتی ہیں۔ یہی عورتیں تمام فیکٹریوں اور بینکوں سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ انہی کے ہاتھوں میں دنیا کی قوت خرید ہوتی ہے۔ شکر کرنے کی یہ بات ہے کہ ان میں تنظیم نہیں ہے ورنہ یہ تمام کاروبار کو تہس نہس کر کے رکھ دیتیں۔

جس کسی نے کوئی چیز ڈیزائین کرنی ہو یا بنانی ہو تو اسے عورتوں کی نفسیات اور ان کی پسند کا خیال رکھنا چاہے اور ان کی مارکیٹ پر، حکومت پر کنٹرول کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ پہلے زمانے میں جیسے شاعر بادشاہوں کے لئے شاعری کرتے تھے اور امیر بن جاتے تھے۔ اس طرح آج کل عورتوں کو ان کی پسند کی چیزیں شہروں میں مہیا کریں وہ آپ کو امیر بنا دیں گی۔

ہر تجارت اور پیشہ میں یہ یاد رکھیں کہ دو جنسیں موجود ہیں۔ یعنی مرد اور عورت اور یہ کہ ہر ایک میں جنسیت ہے۔ اس خیال اور اصول کو اپنے کارندوں، اپنے سیلز مین، اپنی کارخانہ کی پالیسی، وغیرہ پر عمل میں ملحوظ رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کس خوش اسلوبی سے اپنے مسائل حل کر سکیں گے اور اپنی جگہ کو ٹھیک ٹھاک کر لیں گے۔

ہر ایک شعوری اور غیر شعوری فعل عمل کرتے ہیں

اس باب میں میں انسانی شخصیت کی پراسراریت کے حصے کے بارے میں بات کروں گا۔یعنی تحت الشعوری شخصیت، عام طور پر لوگ اس موضوع سے بچتے ہیں کیونکہ اس موضوع پر روحانیت اور روحانی طاقت پر ریسرچ کرنے والوں نے کافی گڑ بڑ مچائی ہے اور اب تک یہ موضوع سائنس اور اوہام پرستی کے بین بین ہے۔ اسی میں اب تک سائنسی طریقہ سے یا تجربات سے چیزیں ثابت نہیں ہوسکیں۔

بہرصورت اب تک جو باتیں واضح ہوئی ہیں ان کو جاننا ضروری ہے تا کہ انسانی فطرت کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔آپ خود اپنی شخصیت کو اس وقت تک نہیں پہچان سکتے جب تک آپ تحت الشعور کی نفسیات کو نہ سمجھ لیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آدمی کے ذہن کے دو حصے ہیں ایک شعوری اور دوسرا تحت الشعوری۔ یہ مشترکہ ورکشاپ اور سٹور کی طرح ہے جس میں ایک ہی مستری کام کرتا ہو۔ورکشاپ میں روشنی ہوتی ہے جبکہ سٹور میں اندھیرا ہوتا ہے۔ اس سٹور میں مستری نے جو جو چیزیں رکھی ہیں ان کے بارے میں بھول بھی گیا ہو کہ اندر کیا کیا پڑا ہے۔ہوسکتا ہے کسی دن ہم اس قابل ہو جائیں کہ سٹور میں پڑی ہر چیز کا احساس کرسکیں یا پتہ ہو کہ کیا کیا پڑا ہے اور کہاں کہاں۔اور جو آدمی یہ کرسکا تو وہ انسانی نسل کا اعلیٰ ترین نفسیات دان ہوگا۔

ضروری بات جو سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم مکمل طور پر شعوری طور پر جاگ نہیں رہے ہوتے۔اور نہ ہی اپنے آپ کے بارے میں پورا شعور رکھتے ہیں۔شعور کو ایک لالٹین کی طرح سمجھ لیں جو کہ ایک تاریک کمرے میں لے جائی جاتی ہے۔آپ کو پھر بھی پتہ نہیں چلتا کہ اندر کیا کیا ہے۔ جہاں جہاں روشنی ہوتی ہے اس کا شعور ہو جاتا ہے۔اس طرح دنیا کے مختلف مواقع ملنے پر ہی آپ کو اپنی قابلیت کا شعور ہوتا ہے ورنہ آپ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے لاعلم ہی رہتے ہیں۔

یا پھر آدمی کو زمین کی طرح سمجھ لیں کہ اس کے اوپر کے حصے میں پتلا سا حصہ شعوری ہوتا ہے اور اس کے نیچے ابلتا ہوا لاوا۔تحت الشعور کی ذات کے تحت الشعوری حصے سے ہی آدمی کی طبیعت کی تشریح ہوتی ہے۔ جب وہ ایک دم ابل پڑتا ہے۔اور کیسے ایک اچھا بھلا آدمی ایک لمحہ میں یا تو بہادری کے جوہر دکھلا لیتا ہے یا پھر بڑے سے بڑے جرم کر بیٹھتا ہے۔

ریڑھ کی ہڈی کے اوپر Medula Oblongata ہوتا ہے جو تحت الشعور کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ جسم کے خودکار حصے کے سوچ بورڈ کا کام دیتا ہے۔ یہ حصہ ذہن کے شعوری حصے کو روزانہ کے افعال سوچ سمجھ کر کرنے سے آزاد کر دیتا ہے۔اور اسے دوسرے کام سوچنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔اور دن کے روزانہ کے کام شعوری حصے کو بغیر سوچ کے کرنے میں مدد دیتا ہے۔اور یہ کام کاج صرف اسی صورت شعوری سوچ کے ساتھ کئے جاتے ہیں جبکہ تحت الشعور کے فعل میں خرابی ہو۔

تحت الشعور کے ذریعے ہی جسم کام کرتا ہے اور روزانہ کے کام عادات کے تحت کرتا ہے۔اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ کریکٹر بھی تحت الشعور کے ذریعے ہی بنتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم تحت الشعور کو براہ راست کنٹرول کر کے کریکٹر کو ترتیب دے سکیں۔اگر یہ ممکن ہوا تو پھر یہ سب سے حیرت انگیز چیز ہوگی۔

ایک آدمی کا کیریکٹر دراصل بنیادی حصہ ہوتا ہے جو کہ تحت الشعور میں پنہاں ہوتا ہے۔اس کی شہرت دراصل اس کے ظاہر کے حصے سے

ہوتی ہے۔مگر کریکٹر وہ ہوتا ہے جو کہ سٹور ہاؤس کے تاریک خانوں میں پڑی ہوئی چیزوں سے بنتا ہے۔ جب ہم کسی کی فطرت میں کمی یا بیماری پاتے ہیں تو وہ دراصل تحت الشعور کے حصے میں خرابی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

پاگل پنا دراصل بعض خیالات کے اکھٹے ہونے سے ہوتا ہے جو کہ جذبات کے تحت ایک دوسرے سے یکجا کر دیئے جاتے ہیں۔اور یہی خیالات پختہ ہو کر دوسرے خیالات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔اسی سے "Complex" بنتا ہے۔انہی خیالات سے انسان دوسروں سے مختلف ہو جاتا ہے اور پھر دماغی بیماری بن جاتا ہے۔ پہلے درجے میں اس کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے مگر بعد میں مشکل ہو جاتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کوئی آدمی بھی سو فیصد نارمل نہیں ہوتا، نہ ہی متوازن ہوتا ہے۔ ہر ایک کا ذہن بعض جذبات کے زیر اثر پاگل ہو جاتا ہے۔اور ہر کام میں ذہن سے کام نہیں لیا جا سکتا اور نہ ہی سوچ سمجھ سے کام لیا جاتا ہے۔آپ اپنے آپ سے پوچھیں (اور یہ سب کے ساتھ یہی معاملہ ہے) کہ آپ بہت سارے موضوعات پر جذبات اور رائے کو ترجیح دیتے ہیں بہ نسبت حقیقت کے۔

ہر آدمی کے ذہن میں خواہشات، جذبات اور خیالات کی جنگ جاری رہتی ہے اور بہت کم اس کو کنٹرول کر کے متوازن راہ اختیار کرتے ہیں اور اپنی جذباتی اور ذہنی قوتوں کو متوازن بنا لیتے ہیں۔ ذہن میں دراصل ہر وقت ایک قسم کے خیالات، دوسرے خیالات سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ایک جذبہ دوسرے پر غالب آنے کی کوشش میں لگا ہوتا ہے۔اور ایک "Complex" دوسرے سے دست و گریباں ہوتا ہے۔اسی میں ماضی کی طرف رجحان ہوتا ہے۔اور مستقبل کی خوش آیندہ امیدیں بھی کھینچتی ہیں۔اس میں آپ جیسا بھی آدمی بننا چاہتے ہیں اس کی خواہش ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہی حالات کی مجبوری ہوتی ہے۔اسی میں نیک اور بد دونوں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔

ان سب خواہشات، جذبات احساسات کے ساتھ ہی عقل بھی اپنا اثر دکھاتی ہے اور بنیادی جذبوں کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس طرح جسم کے اندر کے غدود بھی مختلف کیمیائی تبدیلیاں لاتے ہیں۔مختلف احساسات یا جذبات جسم کو اندر ہی اندر اثر پذیر کرتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب بھی ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ان سب کے زیر اثر ذہن میں دراصل ہر وقت اختلاف اور جنگ جاری رہتی ہے اور کبھی پتہ نہیں چلتا کہ ذہن کا کون سا حصہ کنٹرول حاصل کرے گا۔

تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب اور حل یہی ہے کہ تحت الشعور کو قابل اعتماد بنایا جائے تا کہ اندر سے کنٹرول کرنے والا حصہ ہی اصل اتھارٹی بن جائے۔کنٹرول کرنے سے ہی سب کچھ حاصل ہوگا، بجائے انتشار اور افراتفری کے۔اپنے ذہن کو کنٹرول میں رکھیں اور پنے موڈ کو ختم کر دیں تا کہ جو آپ کرنا چاہیں وہی ہو۔اپنے غصے کو قابو میں لائیں۔اپنے اعتقادات کو چیلنج کریں اور حقیقت کو سمجھیں۔

ہنسی مذاق کی اہمیت کو سمجھیں۔کوئی بھی کبھی ہنسنے والا پاگل نہیں ہوا بلکہ ہنسنے کھیلنے والا ہی پاگل پنے سے نکل آتا ہے۔زندگی کو کھیل سمجھ کر گزارنے والے ہی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔اس کو بوجھ سمجھنے والا تو روتا ہی رہے گا حالانکہ جتنی زندگی ہے وہ گزر کر ہی رہے گی، چاہے رو کر یا ہنس کر۔

اپنے ذہنوں کو رازوں کے چھپانے اور اپنے آپ کو منافقانہ رویئے سے بچایئے۔ نہ ہی ذہن کو ہر وقت چوری پر مجبور کیجئے۔ہم اپنے ذہنوں کو سازشوں سے پاک رکھ سکتے ہیں۔ہم اپنے ذہن کی تاریکیوں کو روشنی سے اجالا کر سکتے ہیں۔ہم اپنے ذہنوں کے بوجھ کو بات چیت کر کے ہلکا کر سکتے ہیں۔ اکثر جب ہم ڈاکٹر کو جا کر اپنی تکلیف بتاتے ہیں اور وہ ہمیں دوائی دیتا ہے اور ہم ٹھیک ہو جاتے ہیں تو دراصل دوائی کی بجائے ہمارا صرف بتانا ہی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔

آپ اپنے ذہن کو مکمل طور پر متوازن نہیں بنا سکتے مگر اس میں زیادہ سے زیادہ اچھے خیالات ڈال سکتے ہیں۔ آپ ان میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں اور آپ کافی حد تک اپنی روح کے کپتان بن سکتے ہیں۔

اس کی بہترین مثال میں آپ کو توپ کے گولے کے اثرات سے دیتا ہوں۔ جنگ میں توپ کے گولے کے پھٹنے سے سینکڑوں سپاہی یا تو اندھے ہو گئے یا بہرے۔ بعض کی یادیں گم ہو گئیں۔ یعنی ان کے ذہن میں ہل چل مچ گئی حالانکہ ان کے ذہن جسمانی طور پر بالکل ٹھیک حالت میں تھے۔ اور ان میں سے بہت سے بعد میں بالکل ٹھیک بھی ہو گئے۔ اس طرح جب زندگی کے دوسرے معاملات سے برا اثر پڑتا ہے تو ذہن میں ہل چل مچ جاتی ہے اور یہی اثر پیدا ہوتا ہے حالانکہ ذہن بالکل ٹھیک حالت میں ہوتے ہیں۔ اس حالت میں بیماری ذہنی ہوتی ہے جسمانی نہیں۔ ان میں توپ کے گولے کے ڈر والی بیماری آ جاتی ہے یا ایسے سمجھ لیں کہ انسانی ذہن میں جیسے موچ آ جاتی ہو۔ جوں ہی یہ موچ ختم ہوتی ہے وہ دوبارہ کام شروع کر دیتا ہے۔

اسی طرح جب کسی انسان کے ذہن میں کسی فکر، سوچ، غصے سے موچ آ جاتی ہے تو وہ بھی غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ جوتے میں ایک چھوٹا سا کنکر پاؤں کو تکلیف دیتا ہے اسی طرح ذہن میں ایک فکر والا خیال ذہن کو تکلیف دیتا رہتا ہے۔ جب تک آپ اس خیال کو حقیقت کا سامنا نہ کرائیں گے یہ آپ کو تکلیف دیتا رہے گا۔

ذہن کا ایک اصول ہے کہ ''ذہن کو حقیقت پر عبور ہو جانا چاہیے'' جوں جوں خیالات ذہن آتے جاتے ہیں ذہن کو ان کو سمجھ کر اپنی اپنی جگہ رکھتے جانا چاہیے۔ جب کوئی خیال انسانی ذہن پر حاوی ہو جائے تو پھر ذہن کو اس خیال سے ڈر آنے لگتا ہے۔ اسے ہی ذہنی بیماری کہتے ہیں۔ جب آپ کسی دوست یا ڈاکٹر سے بات کر کے اس کی صلاح مشورہ سے اس خیال کی حقیقت سمجھ لیں گے تو وہ ذہن سے اتر جائے گا۔ جب ذہن اس کو سمجھ لے گا تو ذہن پھر سے آزاد ہو جائے گا۔ اسی لئے جو آدمی بھی اپنی فکروں، گناہوں، محرومیوں پر علیحدہ اور اکیلے بیٹھ کر سوچے گا یا خیالی گناہوں کے بارے میں سوچے گا تو اس کا ذہن ان خیالات کے بوجھ تلے آ جائے گا۔ اور Shell Shock والا اثر ظاہر ہو جائے گا۔

امیر آدمیوں کی عورتیں عام طور پر کام نہ ہونے سے بور ہو جاتی ہیں۔ ان کے ذہن کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے سے قاصر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کے بارے میں سوچنے لگتی ہیں۔ ایسی عورتیں پہلے خود غرض ہو جاتی ہیں پھر اپنے آپ میں گم ہو جاتی ہیں اور آخر کار غیر متوازن۔

اسی طرح جو لوگ زندگی میں ناکام ہو جاتے ہیں جیسے غریب آدمی کے ذہن میں شکست کا احساس ہوتا ہے کہ دنیا نے ان کو جیسے ناپسندیدگی سے پھینک دیا ہو۔ یہ خیال بہت ہی سخت، اور ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی شکست کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ توپ کے گولے کے ڈر والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ زیادہ تر ماضی کے تلخ تجربات کا اثر ہوتا ہے۔ ایسا تجربہ انکے ذہن پر سوار ہو جاتا ہے اور ذہن بھولتا نہیں۔ کیونکہ ذہن اس خیال پر حاوی ہونے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ جب ذہن اس پر کنٹرول نہیں کر پاتا تو اس سے ڈرنے لگتا ہے کیونکہ وہ اس خیال کو کنٹرول نہیں کر سکتا ہے۔ یہی خیال دراصل اس کی پریشانی بن جاتی ہے نہ کہ اصل خیال۔

ایسے لگتا ہے کہ زندگی ایک بہتا ہوا دریا ہو۔ جب تک زندگی بہتی رہتی ہے تب تک وہ صاف شفاف رہتی ہے۔ جوں ہی راستے میں کوئی رکاوٹ آ جائے تو پانی کی طرح رک جاتی ہے اور رکا ہوا پانی ہمیشہ گدلا اور بدبودار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی جب رک جاتی ہے۔ جب خواہشیں تکمیل کو نہیں پہنچتیں اور زندگی کی روانی کی وجہ سے رک جاتی ہے تو پھر زندگی میں گدلا پن آ جاتا ہے اور ذہن میں بدبو آنے لگتی ہے اور وہ کسی شکست خوردہ دشمن کی طرح تتر بتر ہونے لگتا ہے۔

عام طور پر ایسی ذہنی حالت میں زیادہ تر لوگوں میں مجرمانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ رکاوٹ کو دور کرنے کی بجائے رکاوٹ کے گرد سے نکل جانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے جھوٹ، فراڈ، سازش یا کسی بھی منفی سوچ کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے ذہن حقیقت کی دنیا سے نکل کر اپنی ہی پیدا کردہ دنیا میں آ جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی درست ہے۔ وہ اپنے ہر عمل کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک جرم کی بجائے اس کا نعم البدل پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا میں شکست اور پاگل پنے کی وجہ سے جرائم کی وارداتیں ہوتی ہیں۔

یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کو عام لوگ ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔ عالم لوگ بھی تحت الشعور کی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب نہیں کر سکے۔ لیکن کم از کم اس حقیقت تک ہم پہنچ گئے ہیں کہ کوئی ایسی حقیقت ہے جس کا نام سچ کی روح ہے۔ یہی سچ ہمیں شکست کے باوجود دوبارہ محنت پر ابھارتا ہے اور ماضی کو بھلا دیتا ہے اور اس کی حقیقت سمجھ کر دوبارہ کوشش کرنے کی سمجھ دیتا ہے۔ یہی سچ ہمیں ناگہانی خوفوں سے نجات دلاتا ہے۔ یہی سچ ہمیں حسد، انتقام، سستی، کاہلی اور خود غرضی سے نکال لاتا ہے۔

یہی سچ ہمیں ہر وہ خیال جو ہمارے ذہن میں داخل ہوتا ہے پر کنٹرول دیتا ہے۔ یہی سچ اور سوچ ہمیں اصل خوشیاں، کریکٹر اور کامیابی عطا کرتا ہے۔

چودھواں باب

ہر ایک نصب العین رکھتا ہے

ہر ایک کی فطرت میں خاکی اور نوری یا روحانی حصے ہوتے ہیں۔ ہر ایک میں جبلی فطرت ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ تصوراتی محل بھی بناتا ہے۔ اور کسی نصب العین کو متعین کر کے اس پر چلنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ میں نے لفظ نصب العین اس لئے لکھا ہے کہ اس سے بہتر لفظ مجھے مل نہیں سکا۔ نصب العین لکھنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں کوئی ایسا تصوراتی، مثالی مقصد پیدا کر لیتا ہے۔ جس کو حاصل کرنے کی یہ کوشش کرتا ہے۔ چاہے یہ مقصد حقیقت سے تعلق نہ رکھتا ہو۔

انسانی فطرت کی یہ عادت ہم بالکل نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ انہی نظریاتی خوابوں پر یا تو لوگ ماضی کی طرف کھنچتے ہیں یا پھر مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ انہی نظریات سے ہیرو، موجد، شہید، شاعر، انقلاب پسند جنم لیتے ہیں۔ اور انہی سے پاگل بھی بنتے ہیں۔

جیسے کہ کرسٹل Crystal یا بلور سے مختلف شکلیں، زاویئے اور خوبصورت رنگ بنتے ہیں، اسی طرح انسان بھی اپنے اذہان میں بعض حقیقتوں یا صرف خیالی تصویروں سے شکلیں بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے تصورات سے وہ دنیا کو سجانا چاہتے ہیں۔ اس رویئے یا رجحان کی تاریخ اگر مرتب کی جائے تو انسان کی زیادہ تر رسوم اسی کا کرشمہ نظر آئیں گی۔ غالباً یہ انسانی ذہن کی خاصیت یا خصلت ہے کہ یہ خوبصورت چیزیں بنانا چاہتا ہے۔ ان کی آرائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح یہ الفاظ، خیالات جذبات و احساسات کو بھی خوبصورت شکلیں عطا کرنا چاہتا ہے۔ اور خوبصورت مناظر کو کھینچنے کی بے پناہ خواہش رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کسی بھی بات یا کسی چیز پر شہرت، فریب نظر، سحر جادو کا احساس پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں سوائے من موجی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں صرف ایسا جادو ہوتا ہے کہ وہ نظر کا فریب یا آنکھوں یا نظروں کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ اصل حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ مگر انسان اس فریب نظر کو پسند کرتا ہے۔ جیسے کہ بچے فریب خیال سے چھڑی کو گھوڑا بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں مرد بھی اپنے لئے چیزوں کو مختلف تصور کر لیتے ہیں۔ یہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں رہا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ ہم اس کا سامنا کرنے سے جھجکتے ہیں۔

ہمارے نصب العین دراصل ہمارے ذہنوں کے لئے افیم کا کام دیتے ہیں۔ ان سے ذہنوں کو نشہ سا ہو جاتا ہے۔ ان خیالات و تصورات سے ہی ہم یا تو دل چھوڑ جاتے ہیں یا پھر جوش میں آ جاتے ہیں۔ انہی تصورات سے زندگی کی تلخیاں اور سختیاں کم بھی ہوتی ہیں اور زندگی خوشگوار لگنے لگتی ہے۔

اگر ہم سوچیں تو واقعی ان خوابوں، تصوروں، امیدوں سے زندگی کیا بنے گی۔ کچھ بھی نہیں۔؟ اگر چہ ہماری چھوٹی سی زندگی روزانہ گھٹتی جاتی ہے۔ مگر ہم عمر کے بڑھنے کے دن مناتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ ہم جئے ہی جائیں گے اور بوڑھے نہیں ہونگے۔ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ ہم آنے والے کل کی خوشیوں، مسرتوں کی امید میں جئے جاتے ہیں۔

ہر قوم میں پریاں ہوتی ہیں۔ قوس قزح اور سنہرے دن۔ پرانے دنوں میں جن بھوت، دیو کی خیالی مخلوق رہتی تھی۔ اور آج کے دن بھی خیالی تصورات، اصول نظریات موجود ہیں جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر قوم کی شاعری، میوزک اور کہانیاں سب کی سب تصورات کی باتیں کرتی ہیں، بجائے حقیقتوں کے۔ اور جب ہم نیک جذبات، احساسات میں بستے ہیں تو ہمیں اپنی فطرت پاک صاف لگنے لگتی ہے۔ غرضیکہ

تصورات کی دنیا میں رہ کر ہم وہ کچھ بن سکتے ہیں جو ہم نہیں ہوتے یا جس کی خواہش کرتے ہیں۔

جیسے ریاضی، سائنس، معقولات یہ سب نسبتاً نئی چیزیں ہیں۔ یہ سب تجرباتی ہیں۔ اسی طرح ہماری فیکٹریاں، ملیں صنعت وحرفت و تجارت سب کل کی باتیں ہیں۔ یہ مشینیں چند لوگوں نے قوموں پر اور ذہنوں پر مسلط کر دی ہیں مگر یہ اب بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ان تبدیلیوں کے باوجود ابھی تک قوموں میں ایسی تبدیلی نہیں آسکی جس کی وجہ سے وہ سائنسی اور انسانی دونوں سطحوں پر ترقی کر سکیں۔

تصورات صرف انسانوں میں ہی نہیں ہوتے۔ جانوروں میں بھی ہوتے ہیں۔ ناروے میں ''لیمنگ'' نام کے چوہے بچے بہت زیادہ دیتے ہیں۔ اور پھر اچانک لاکھوں کی تعداد میں یہ چوہے خود بخود ہی سمندر کی طرف چل دیتے ہیں۔ اور ڈوب جاتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ چوہے کسی دور دراز تصوراتی منزل کی طرف جانے لگتے ہیں اور اس کوشش میں سب غرق ہو جاتے ہیں۔

یہ تصورات ونصب العین قومی سطح پر اپنا لئے جاتے ہیں تو ان میں بے پناہ قوت آجاتی ہے۔ تب یہ ہر اس تصور یا شخص کو ہلاک کر دیتے ہیں جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ تب زمینوں پر ایسے مسلط ہو جاتے ہیں اور ان کی حفاظت ایسے کی جاتی ہے جیسے کہ یہ کوئی خزانہ ہوں۔ ان کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار نہیں کیا جاتا بلکہ من وعن وہ قبول کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ تصورات اونچے درجے کے ہوں تو ان سے ترقی ہوتی ہے۔ اگر یہ نچلے درجے کے یا منفی ہوں تو ان سے خباثت اور تباہی پھیلتی ہے۔

آزادی مساوات بھائی چارہ، پاکیزگی، سچائی یہ سب ایسے نصب العین ہیں جو کہ تصوراتی ہیں۔ اور ذہن کی پیداوار ہیں۔ جوانی بوڑھوں کے لئے باعث رشک ہوتی ہے اور امارت غریبوں کے لئے یا شادی کنواروں کے لئے۔ اس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج میں جا کر علم حاصل کرنے یا ڈگری لینے کا اپنا ایسا جادو ہے کہ ہر ایک اس کالج کا پڑھا ہوا ہونا چاہتا ہے۔ اگر سب کو معلوم ہو جائے کہ ان جگہوں پر کیا کیا ہوتا ہے تو ہم مایوس ہو جائیں گے۔ اگر کوئی بھی ان دونوں اداروں کے تعلیم اور وقت گزارنے کے طریقوں کا سائنسی طریقے سے جائزہ لے تو یہ سب وقت کا زیاں لگے گا اور دیانت کے بالکل خلاف بھی۔

اسی طرح لبرل، کنزروٹو سیاسی پارٹیوں کا سحر ہے۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مسالک کا اپنا اپنا جادو ہے۔ اسی طرح لندن، نیویارک پیرس کے شہروں، کا اپنا مزہ اور جادو ہے۔ اس طرح آرمی، نیوی، وکالت، ڈاکٹری کی اپنی کشش ہے۔ اسی طرح شکیسپیئر، پارلیمنٹ، جمہوریت کا اپنا اپنا مزہ ہے جس کے پیچھے لوگ پڑے ہیں۔ یہ سب جادو اپنے اپنے پیشے، اداروں، پارٹیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور ان اداروں کے ذریعے یہ نصب العین اور تصورات تجارت کے مال کی طرح بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ ہر قوم کی بنیاد اپنی تصورات پر رکھی جاتی ہے۔ اس لئے ہر قوم کے اداروں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔

ہم امید کر سکتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی انسان اپنے تصورات کو انکے نتائج سے مقابلہ کر کے اپنائیں گے یا رد کر سکیں گے۔ یہ امتحان ہر نئے تصور رکھنے والے کو پاس کرنا ہوگا جیسے کہ آج کل کسی ایکسپرٹ کو اپنی قابلیت یا صلاحیت کو دکھانا ہوتا ہے کہ اس کے نظریہ میں جس کا وہ دعوٰی کرتا ہے، کتنی سچائی ہے۔ اس کو اپنے نتائج سے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اونچے تصورات کو بھی اپنے نتائج سے ثابت کرنا چاہیے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو ضرور ٹسٹ کرنا چاہیے جو کہ پرانے نظریات کو بیچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بزنس میں بھی تصورات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ وہ تصورات جو نتائج دکھانے کے لائق ہوتے ہیں، اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں، لوگوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ وہ تصورات جو بنیادی طور پر ذاتی منفعت کے لئے ہوتے ہیں، وہ لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ مثلاً

کپاس کی صنعت کو لیں۔ جیمز واٹ، آرک رائٹ، وٹنی وغیرہ نے کاٹن کی صنعت کی بنیاد رکھی۔ انکے تصورات حقیقت پر مبنی تھے۔ ان کے خواب حقیقت کا روپ دھار گئے لیکن کیا آج کا کپاس کا صنعت کار ویسے ہی تصورات رکھتا ہے یا پرانے تصورات سے ہی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کیا وہ اس صنعت کی ترقی کا باعث بن رہا ہے یا کہ پرانے تصورات کو ہی نیا کر کے بیچ رہا ہے۔ اگر جواب نہیں میں ہے تو پھر وہ اس امتحان میں فیل ہو جائے گا۔

آج کل کی صنعت و حرفت میں ہمیں نئے تصورات کو پرکھنا چاہیے تا کہ صرف فائدہ مند تصورات کو فروغ دیا جائے۔ ہمیں اس رویئے کا احساس ہونا چاہیے اور اس سے بچنا چاہیے کہ ہر انسان وہی کچھ مانتا ہے جو کہ وہ ماننا چاہتا ہے۔ وہی کچھ دیکھتا ہے جس کو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے ان تصورات سے بچنا چاہیے۔ جو ہمیں وقتی طور پر فائدہ دیتے نظر آتے ہوں۔

نظریات کے غلام نہ بنیں۔ نظریات کو ضرور اپنائیں اس لئے کہ کوئی انسان بھی نظریات کے بغیر نہیں رہ سکتا مگر ان کو پرکھیں، ان کو استعمال کریں۔ ان میں ترمیم کریں یا تجربہ کر کے دیکھیں اور ان کو فائدہ مند یا نقصان دہ دیکھ کر رک جائیں اور اس کے مطابقان کو، اپنائیں یا رد کر دیں۔ لیکن ہر قیمت پر انہیں نہ اپنائیں اس لئے کہ وہ آپ کو پسند ہیں۔ کسی بھی چیز کے انتخاب کا اصل ٹسٹ اس کا فائدہ مند ہونا یا نہ ہونا ہے۔ آپ اپنے لئے وہ نظریات چنیں جو آپ کو فائدہ پہنچا سکیں۔ یہی خوشی، سکون اور شہرت کا راز ہے۔ یعنی ان نظریات و تصورات کو اپنانا جو آپ کی فطرت یا عادت اور رویئے کے مطابق ہوں۔

آپ اپنی قوت فیصلہ اور ارادی کو اور اپنی عقل کو دوسروں کے نظریات کا تابع نہ بنا دیں۔ نہ ہی دوسروں کے غلط سلط تصورات کو اپنائیں۔ آپ اپنے نظریات کو اپنے آپ میں سے منتخب کریں۔ اپنے ہمسایوں، یا دوستوں کے نظریات کو اپنی زندگی نہ بنائیں۔ حقیقت کو اپنانے میں صرف حساب دان کی طرح نہ ہو جائیں کیونکہ زندگی میں تصورات کی اپنی جگہ اور فائدہ ہے۔ اسی طرح نمائش وغیرہ کی اپنی جگہ اور فائدہ۔

انسانی فطرت میں بظاہر دو مختلف و متضاد چیزیں نظر آئیں گی مگر یہ ان پر حاوی نظریات و تصورات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ حقیقت کا دامن ضرور ہونا چاہیے۔

ہمیں پرانے اور نئے نظریات کے اپنانے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ نئے نظریات عام طور پر گپ شپ سے شروع ہوتے ہیں اور ادہام پرستی تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ جب جوانی میں ہوتے ہیں تو پریکٹیکل ہوتے ہیں۔

اختتامیہ

اگر کوئی کتاب عملی سبق کے طور پر لکھی گئی ہے تو وہ یہ کتاب ہے۔ یہ کتاب دراصل ''اپنی ذات کے بارے'' میں چودہ سبقوں پر مشتمل ہے۔اور یہ چودہ سبق استعمال کرنے کے لئے ہیں نہ کہ صرف بحث مباحثے کے لئے۔ میں ہمیشہ خیالی آدمیوں کی نسبت مثبت انداز والے، عمل پسند، افادیت پسند لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ میں ہمیشہ ان چھوٹے سے چھوٹے حل میں بھی دلچسپی لیتا ہوں جس کو ہم سمجھ سکتے ہیں، بجائے مکمل حل کے۔ میرا خیال ہے کہ ہر تھیوری، مفروضے کا ٹسٹ ہی نتائج ہی ہوتے ہیں۔

اس لئے میں یہ کتاب آپ کو پیش کر رہا ہوں تا کہ اپنے آپ کو سمجھنے اور ترقی دینے میں آپ کی مدد کر سکے۔ اگر کوئی غصے میں اسے پھینک دے تو اس سے مجھے گلا نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے جو اپنے آپ میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ کتاب اپنے ذاتی تجربے سے لکھی ہے۔

میں یہ بات دیکھنے اور مشاہدہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ جس علم کو بھی میں نے سیکھنے کی کوشش کی اس میں انسانی فطرت کا بہت بڑا ہاتھ دیکھا۔ میں نے جب فیکٹری کے انتظام کو سیکھا تو پتہ چلا کہ انسانی فطرت کے گھنے جنگل میں سے گزرنا پڑے گا۔ جب میں نے سیلز، اشتہار بازی، آرگنائزیشن غرضیکہ جو بھی بزنس کا میدان چھاننا چاہا۔ وہاں مجھے انسانی فطرت سے واسطہ پڑا۔ اور اسی پر بزنس کا دارومدار قرار پایا۔ جب بھی میں نے کسی اصول یا نظم وضبط کو سیکھنا یا سمجھنا چاہا۔ وہاں بھی انسانی فطرت آڑے آئی۔

جہاں بھی کوئی مسئلہ آتا تھا تو وہ ''لوگوں'' سے شروع ہوتا تھا۔ تو میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ کوئی بھی مسئلہ لوگوں کی فطرت جانے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ یہی سوچ کر میں نے انسانی فطرت کا مطالعہ شروع کیا۔ جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے پاس کوئی بھی مفروضہ نہ تھا۔ میں ایک چیز نوٹ کرتا تھا اور پھر بطور امتحان اس کو دوسروں پر آزما کر دیکھتا تھا کہ آیا یہ ہر ایک پر منطبق ہوتا ہے کہ نہیں۔

میں نے امتحان کے طور پر کسی بھی چیز کو اس کی ظاہری شکل وصورت سے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ہر چیز پر شک وشبہ سے شروع کیا جب تک کہ امتحان کے بعد وہ چیز ثابت نہ ہو گئی ہو۔ مثلاً میں نے یہ نہ پوچھا کہ آدمی کیا چیز ہونی چاہیے۔ بلکہ یہ سوچا کہ آدمی کیا ہے؟ اس کی فطرت کس چیز نے بنائی ہے۔ اس کے محرکات کیا ہیں۔ اس میں کیا کیا مشترک ہے۔ وہ کس چیز سے بنا ہے۔ وہ کیسے اور کیوں بنا ہے؟ اس کی اندرونی حقیقت کیا ہے۔ اور ظاہر کیا ہے۔

جس چیز نے مجھے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ اس حقیقت کا انکشاف تھا کہ انسان اور حیوان میں بہت کم فرق ہے۔ میں نے دیکھا کہ مجھ میں اور میرے Collie کولی کتے میں بہت کم فرق ہے۔ مثلاً دونوں کی ضروریات، احساسات، ڈر، خیالات میں بہت کم فرق تھا۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ میری ضروریات واحساسات وڈر میں ترقی ہو گئی تھی۔ جبکہ اس میں اب تک بنیادی سٹینڈرڈ موجود تھا۔ اس طرح ہر انسان اور پودوں میں کافی قدر مشترک نظر آئی۔ چودہ ابواب میں سے کافی جہتیں ہم دونوں میں شامل ہیں۔

تیسری بات جس سے میں حیرت زدہ رہ گیا تھا وہ یہ تھی کہ ان اسباق واصولوں سے میں خود زمین میں شامل ہو گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی چاند، سورج ستاروں کے ساتھ۔ ہم بے وقوفی سے ان سب کو مادہ اور قوت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کو جذبات، خیالات سے عاری سمجھتے ہیں اور ان میں روحانیت کو مفقود سمجھتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ چودہ باتیں یا تو مرکز یہ ہیں یا غیر مرکز یہ centripetal or centrifugal۔ جیسے

کہ ستارے اپنی جگہ پر انہی دوقوتوں کے اعتدال اور متوازن ہونے سے ہی قائم ہیں، اس طرح انسانی فطرت بھی انہی دوقوتوں کی وجہ سے قائم ہے۔ جو کہ ظاہراً ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد سمتوں میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ میرے خیال کے مطابق ان چودہ میں سے سات باتیں مرکزیہ ہیں اور سات غیر مرکزیہ۔ ان کی ترتیت یوں سمجھئے۔

مرکزیہ	غیر مرکزیہ
1 ہر ایک تقلید کرتا ہے نقل کرتا ہے	1 ہر ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔
2 ڈرتا ہے۔	2 ہر ایک محسوس کرتا ہے۔
3 اعتقاد رکھتا ہے۔	3 مختلف ہے۔
4 عادات رکھتا ہے۔	4 سوچتا ہے۔
5 رہنما کی عزت کرتا ہے	5 تبدیل ہوتا رہتا ہے۔
6 جنسیت رکھتا ہے۔	6 اعتقاد رکھتا ہے۔
7 ہر ایک کو تعریف/سرزنش کی ضرورت ہوتی ہے۔	7 شعوری ہے۔ اور غیر شعوری بھی۔

مرکزیہ عادات ہم کو سماجی انسان بناتی ہیں۔ یہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سکھلاتی ہیں۔ یہ غالباً زیادہ تر مادہ اثر رکھتی ہیں۔ غیر مرکزیہ فطرت ہر ایک کو ذاتی انا دیتی ہیں۔ یہ شعوری احساس سے جنم لیتی ہیں۔ یہ جنسی لحاظ سے مردانہ ہیں۔ ان دونوں عادات یا فطرتوں کو ایک دوسرے سے اعتدال دلانے کی ضرورت ہے۔ اگر آدمی میں صرف غیر مرکزیہ یہ عادات ہوں تو وہ ابھی تک ترقی پذیر نہیں ہوا بلکہ اس میں حیوانیت غالب رہتی ہے۔ اس کی اپنی شخصیت نہیں بنی ہوگی۔ اگر اس میں صرف مرکزیہ فطرت ہے تو پھر یا تو وہ غیر قانونی حرکات کرنے والا۔ پاگل یا Genius ہوگا۔ لیکن انتہائی عقل مند۔

ایک نارمل آدمی وہ ہوگا جس میں یہ دونوں قوتیں اعتدال اور متوازن انداز میں موجود ہوں۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے میں نے انسانی فطرت پر یہ چارٹ بنایا ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ہر قابلیت یا فطرت کو ایک حد تک ترقی دی جاسکتی ہے۔ اس سے زیادہ ترقی کرنے سے یہ نارمل نہیں رہتی اور پاگل پنے تک لے جاتی ہے۔ انسانی فطرت کی ترقی کی صورت یہ ہے کہ اس کو ترقی دینے اور روک لینے دونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمیں پابندی بھی لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اور کھولنے کی بھی۔ یعنی جمع تفریق کرنی پڑتی ہے تاکہ توازن برقرار رہے۔ مثلاً اگر آپ میں شوق کی کمی ہے تو یہ نقص ہے۔ اگر شوق کی زیادتی ہے تب بھی نقص ہے یعنی دونوں حالتوں میں اعتدال ضروری ہے۔

ہمیں اگر پرسکون خوشی والی زندگی گزرنی ہے تو افراط و تفریط سے بچنا پڑے گا اور اعتدال کو اپنانا پڑے گا۔ ہمیں خط استواء (Equater) اور قطب شمالی (North Pole) دونوں سے بچنا پڑے گا۔ یعنی Extreme گرمی یا سردی اور درمیانی خطوط (Latitudes) پر رہنا پڑے گا۔

یہ عقل مندی کا اصول ہوگا کہ ذہن کا کوئی بھی گوشہ ایک حصہ سے زیادہ نہ استعمال کیا جائے نہ ترقی دی جائے کہ یہ کنٹرول سے باہر ہو سکے۔ ہر قابلیت کو صرف اسی حد تک ابھارنے کی ضرورت ہے کہ وہ دوسری قابلیتوں پر اثر انداز نہ ہونے لگے۔

تو میرا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہر عادت کی قوت مرکزیہ اور غیر مرکزیہ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے متوازن رکھیں۔ میں نے صرف اس ہر انسانی فطرت کے بارے میں لکھا ہے جو ہر ایک میں موجود ہے۔ دوسروں کے بارے میں میں نے لکھنے سے گریز کیا ہے۔ میں نے ان چند لوگوں کے بارے میں نہیں لکھا جو کہ میوزک سے شغف رکھتے ہیں یا مذاقیہ مزاج رکھتے ہیں یا آرٹ سے انس رکھتے ہیں۔

ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ہم نے بنیاد کو چھوڑ دیا ہے۔ ریت اور اس کے اوپر قلعے بنا لئے ہیں اور خوبصورت عمارتیں۔ افریقہ کے وحشی قبائل کے پاس بنیاد ہے مگر خوبصورت عمارتیں نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دونوں ہی مشکلات میں گرفتار ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کیمیائی اور جسمانی طور پر ایک ہی جیسا ہے یعنی ہر ایک میں 500 پٹھے ہیں 200 ہڈیاں، 4 گیلن خون 24 فٹ لمبی آنتیں اور 72 مرتبہ حرکت کرنے والا دل۔ یہ چاہے بادشاہ ہو یا عام آدمی۔ اس کا یہی حال ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ فعلی طور پر بھی آدمی ایک ہی جیسا ہے۔ یعنی اس کے جسم کے افعال ایک ہی جیسے ہیں۔ اور ایک نسل سے دوسری نسل میں کبھی فرق نہیں پڑا۔

یعنی ہر ایک انسان دوسرے کی مثل ہے۔ فرق بہت ہی کم ہے اور مماثلت زیادہ ہے۔ مثلاً بنیادی طور پر بچپن میں ہر بچہ یہی سوچ رکھتا ہے کہ زمین چپٹی ہے یا یہ ساکن ہے۔ بڑے ہو کر پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔ زمین گول ہے اور یہ حرکت کر رہی ہے۔

اسی طرح وقت آ گیا ہے کہ ہم یہ بات سمجھ لیں کہ نہ کوئی برتر ہے نہ کم تر۔ نہ ہی ہم زیادہ مختلف ہیں۔ یہ صرف ہمارے بچپنے کی سوچ کی طرح ہیں۔ جس میں ہم اپنے آپ کو اس کائنات کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اب بڑوں کی طرح سوچ کر اس غلط خیال سے نکل آنا چاہیے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے آپکا مطالعہ کریں۔ اور خوش کرنے والے غلط تصورات کو ایک طرف رکھ دیں اور اپنی رائے کو حقیقت کے سامنے چھوڑ دیں۔ اور بڑی دیانت داری سے صرف حقیقتوں پر یقین کریں۔ ہم نے اپنے بارے میں جو بھی مفروضہ قائم کر لیا ہے اس کو چھوڑ کر حقیقت پسند بنیں۔

اب تک سائنس پتھروں پودوں جانوروں ستاروں وغیرہ کے علم کی تلاش میں رہی ہے۔ جو کہ انسان سے کم تر درجہ کی چیزیں ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انسان اپنے بارے میں تحقیق کرے۔ اس لئے کہ اس کائنات کا سب سے بڑا راز اور معمہ انسان خود ہے۔

تہذیب کے اس دور میں اچھے لوگ بنانے سے بہتر عمل اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر ہم بہتر نسل بنا سکتے ہیں تو پھر اس سے بڑ کر مستحسن کام اور ہو سکتا ہے۔؟

کیمسٹری کے علم کا کیا فائدہ ہے اگر ہم اس سے انسانوں کو قتل کرنا سیکھتے ہیں۔ دولت کا کیا فائدہ ہے اگر یہ صرف چند ہاتھوں میں رہے گی۔۔ گورنمنٹ کا کیا فائدہ ہو گا اگر وہ لوگوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ اس تعلیم کا کیا فائدہ جو لوگوں میں نفرت پھیلائے اور ان کو ایک دوسرے سے دور کرے۔

یہ کتاب صرف ابتدائیے بلکہ ابتداء کا بھی ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اس علم کا چھوٹا سا حصہ ہے جو کہ ابھی آنے والا ہے۔ یہ شاید پوپٹھنے کا نام ہے۔ اور اس سے اس علم سے اندھیروں پر روشنی پڑے گی جس سے لوگ اپنے آپ کو پہچان سکیں گے۔ اس دن اس کتاب کی کمی بیشی کو معاف کر دیا جائے گا اس لئے کہ یہ ابتدائی محنت ہے۔ اور کاوش۔

انسانی فطرت کا چارٹ

از

ہربرٹ۔این۔کیسن

جہالت کی بنیاد سے شروع ہوکر مثبت یا منفی ترقی کی ممکنات

جہالت سے شروع ہوکر مثبت ترقی کی ممکنات کی حد

جراءت

محبت

قوت ارادی

عزت

کفائت شعاری

قابل تقسیم

خوداعتمادی

شرم وحیا

شوق حب جاہ امنگ

درپے حمایت

غوروفکر

تعظیم احترام

طاقت

آزادی

شرافت

حتیاط

ذہنی بلوغت کی حد

جہالت سے منفی ممکنات کی حد

بناوٹی شرم محتاط

خودستائی وخود بینی خود پسندی انانیت

ضعیف الاعتماد خوش اعتماد

لالچ

غلامی تابعداری

ضد

ہوس شہوت

تندخو بدتمیز اکھڑ

ڈر

کمزوری

طوائف الملوکیت

تشدد

ضعیف الاعتمادی وہم

افسردہ خیال سقیم

تعصب

تشدد

ذہنی گڑبڑ کی حد

پاگل پنا

مترجم کا اختتامیہ

میرے خیال میں یہ کتاب ہر عورت اور مرد، چھوٹے بڑے کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر ان اصولوں کا اپنی زات سے موزنہ کریں تو ان کی سچائی واضح ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے دوسروں کو سمجھنے اور برداشت کرنے کی ضرورت کی سمجھ آنی شروع ہا جاتی ہے۔

اگر ہم نقل کی عادت کو لیں تو پھر سمجھ آ جاتی ہے کہ ہم کیوں ہر بات میں مغربی مالک کی نقل کر رہے ہیں۔ اور کیوں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ اس نے رسول کریم ﷺ کی ذات میں، قامت تک کے لئے، ہمیں اور تمام دنیا کے لوگوں کے لئے، ایک مکمل اسوۃ حسنہ نقل کرنے کے لئے عطا فرما دیا ہے، جو کہ ایک سٹینڈرڈ ہے۔ اگر ہم حضور اکرم اور رحمۃ اللعالمین ﷺ کی نقل کرنا شروع کر دیں تو ہماری زندگی جنت بن جائے۔

اللہ تعالی نے نقل کے لئے **ہمارے لئے رول ماڈل رحمۃ اللعالمین ﷺ کو مقرر فرمایا ہے**

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ o (سورۃ انبیاء۔ آیت 107)

''ہم نے تم کو دنیا والوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔'' تفہیم القرآن

We sent thee not save as a mercy for the peoples.(107-21) Pikthal

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا o

(سورہ احزاب۔ آیت 21)

''درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔'' تفہیم القرآن

Verily in the Messenger of Allah Ye have a Good Example for him who looketh unto Allah and the last Day, and remembereth Allah much. (21-33) (Pikthal)

اتباع رسول ﷺ کی مثال:

برطانیہ کے مشہور پاپ سنگر Cat Stevens جو مسلمان ہو گئے تھے اور مسلمانی نام محمد یوسف ہے۔ وہ کھانے کے بعد پلیٹ کو انگلی سے صاف کر رہے تھے تو انٹرویو لینے والے نے پوچھا کہ اگر آپ کے ساتھی انگریز دیکھ لیں تو آپ کو کیسا سمجھیں گے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا۔

Should I please my Prophet or should I please my countrymen?"My choice is quite clear- My Prophet"

اسی طرح کیسن جب یہ کہتا ہے کہ "" ۔ یاد رکھیں۔ عظیم لیڈر اور رہنما وہی ہو سکتا ہے جو کہ ہمیں عادات بدلنے پر مجبور کر دے یعنی ان عادات کو جو ہمیں نقصان پہنچا رہی ہیں۔ یہی عظیم رہنمائی کا طریقہ ہے کہ لوگوں کی نقصان دہ عادت کی تعریف نہ کی جائے بلکہ ان کو ان کی بری عادات کی بجائے نئی اور بہترین عادات کی طرف مائل کیا جائے۔ عادات کو بنانے والا ہی اصل لیڈر ہوتا ہے۔

To be a habit maker - That is what leadership means.""

تو ہمیں پتہ چل جانا چاہئے کہ تمام بڑے لیڈر، چاہے مذہبی ہوں یا سیاسی یا سوشل ریفارمر، سب یہی کام کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ اپنی مرضی کرنے کی عادت کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور یوں دور جاہلیت میں واپس جا کر زندگی عذاب بنا دیتے ہیں۔ تو پھر اللہ تعالی کی ذات ان کی رہنمائی

کے لئے کوئی نبی بھیج دیتی تھی جس کی آخری ہستی، ہمارے پیارے نبی ﷺ، قیامت تک کے لئے، ہر زمان ومکان میں، لوگوں ی رہنمائی اور سوچنے سمجھنے کی عادات بدلنے کے لئے تشریف آئے۔ ان کے بعد اب نبی تو نہیں آئے گا مگر بڑے آدمی اللہ تعالی بھیجتا رہتا ہے۔ اقبال اور قائداعظم ہمارے لئے بھیجے۔ ماؤزے تنگ کو چینیوں کے لئے بھیج دیا۔ مہاتیر محمد ملائیشیاء کو دے دیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم پاکستانیوں نے بڑے پن کی جگہ چھوٹے پن کو اپنا لیا اور قائداعظم کے بعد کوئی آدمی لیڈر بننے پر تیار نہ ہوا۔ اللہ تعالی سے یہی دعا کی جانی چاہئے کہ وہ ہمیں بھی ایک بڑا آدمی عطا فرمادے جو ہمیں دین اور دنیا دونوں میں، اپنی مثال سے، رہنمائی کر کے کامیاب بنائے۔ آمین

اسی طرح آپ ہر باب کی باتوں پر غور وفکر کر سکتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ سیرت النبی ﷺ کی کوئی سی کتاب اپنے گھر میں رکھ لیں اور حضور اکرم ﷺ کی کوئی سی عادت کو کوشش کر کے اپنی زندگی کا حصہ بنالیں تو قائداعظم کی اس بات کے مطابق، جو ہمارے بچپن میں ہر ریلوے ٹائم ٹیبل پر لکھی ہوتی تھی" کہ اگر آپ ہر سال میں ایک اچھی عادت کو شش کر کے اپنالیں تو مرنے تک آپ بہترین انسان بن جائیں گے۔"

اللہ تعالی ہمیں صحیح سوچیں عطا فرمائے تا کہ ہم دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کرنے والے بن کر رحمت بن سکیں۔ آمین

گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی

مصنف کی دوسری کتب

اردو کتب

1- انقلاب رحمت ۔سیرت رحمت اللعامین ﷺ

2- تحریری وصیت نامہ۔لکھنا کیوں ضروری ہے اور کیسے لکھا جانا چاہئے

3- صدقۃ الفطر۔ عیدالفطر ہمارا تھینکس گونگ ڈے کیوں ہونا چاہئے

4- کتاب الزکوۃ۔ حصہ اول زکوۃ کی فلاسفی، مقاصد، اور شرائط

5- کتاب الزکوۃ۔حصہ دوم سونے، چاندی کا نصاب کے نصاب اور زرعی نصاب

6- کتاب الزکوۃ۔حصہ سوم جانوروں کے نصابوں کی چیکنگ اور تصحیح

7- کتاب الزکوۃ۔حصہ چہارم پلاٹوں اور عمارتوں کے کرائے پر زکوۃ

8- کتاب الزکوۃ۔حصہ پنجم ذرایع حمل ونقل پر زکوۃ

9- اصحاب الفیل سورۃ فیل کی سائینسی تشریح

10- انسانی فطرت ۔ترجمہ ہربرٹ کیسن

11- اونچے عرض البلد پر روزہ رکھنے کی مشکلات اور حدیث دجال کے مطابق حل

12- رویت ہلال کا مسئلہ اور اس کا حل

13- حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر کا نظریاتی مسئلہ پر بحث

14- سورۃ طلاق کی آیت نمبر تین کی کم عمری میں شادی کی اجازت غلط ہے۔اس کا میڈیکل ثبوت

15- حلالہ کی لعنتی پریکٹس سے بچاؤ

16- کتاب الفتاوی۔ چند فتاوی کی اصلاح اور اس کے طریقہ کار کا فارمیٹ

17- کھانے کے آداب میں اسلام اور کلچر کے حصے

18- تاریخ راجو میانہ فیملی

19- قرآن فہمی۔ ایک ایک آیت کی تشریح اور اسے زندگی میں کیسے پریکٹس کرنا ہے

20- کتاب زندگی۔ ذاتی تجربات پر مبنی تحریریں

21- فیصلے کرنے کے قرآن اور حدیث پر مبنی اصول

22- مختلف ریسرچ پیپرز

23- عشر کے اصول کی تشریح

24- غنی کا تعین کیسے کریں گے؟